جماعتِ اسلامی کے پہلے کل ہند اجتماع کی روداد

اخبار کوثر لاہور کے ذریعہ سے اعلان کیا گیا تھا کہ دارالاسلام (پٹھان کوٹ، پنجاب) میں ۶، ۷، ۸ جمادی الاولیٰ ۱۳۶۴ھ (مطابق ۱۹، ۲۰، ۲۱ اپریل ۱۹۴۵ء) کو بروز جمعرات، جمعہ، ہفتہ کل ہندوستان کے ارکانِ جماعت اسلامی کا اجتماع منعقد ہوگا جس میں تمام ارکانِ جماعت کو شریک ہونا چاہیے الا یہ کہ کسی کو کوئی عذر شرعی مانع ہو۔ نیز یہ کہ اگر ہمدردانِ جماعت میں سے بھی کوئی حضرات ہمارے کام کا قریبی مطالعہ کرنا چاہیں تو تشریف لا سکتے ہیں۔ چنانچہ ۱۸ اپریل ۱۹۴۵ء کی رات تک بیشتر ارکان اور ہمدرد تشریف لے آئے اور باقی ۱۹ اپریل کی صبح کی گاڑی اور بسوں سے پہنچ گئے۔ شرکاء اجتماع کی جملہ تعداد آٹھ سو سے زیادہ تھی۔ ٹھہرنے کا انتظام مقامی مسجد، دفاتر، دوسری عمارات اور کچھ کیمپوں اور سائبانوں میں تھا۔ مجمع کی کثرت کے پیش نظر لاؤڈ سپیکر اور عارضی طور پر بجلی کی روشنی کا بھی انتظام کر دیا گیا تھا۔

اجلاس اول

۶ جمادی الاول ۱۳۶۴ھ مطابق ۱۹ اپریل ۱۹۴۵ء بروز جمعرات بعد نماز ظہر

حسب پروگرام امیر جماعت کی طرف سے قیم جماعت نے حاضرین سے درخواست کی کہ وہ مسجد دارالاسلام میں جمع ہو جائیں تاکہ پروگرام کے مطابق اجتماع کی کارروائی شروع ہو۔ چند ہی منٹ بعد سب لوگ مجمع کے وسط میں منبر پر بیٹھے ہوئے امیر جماعت کے دہن پر نظر جمائے ہمہ تن گوش بنے بیٹھے تھے اور اس ایک ہزار کے مجمع میں چاروں طرف بالکل سناٹا تھا۔

امیر جماعت اٹھے اور خطبہ مسنونہ کے بعد اپنی افتتاحی تقریر سے اجتماع کا آغاز فرمایا۔

امیر جماعت کی افتتاحی تقریر

حمد و ثنا کے بعد: دوستو اور رفیقو! آپ کو غالباً یاد ہوگا کہ جس اجتماع میں جماعت کی تشکیل کی گئی تھی اس میں یہ اعلان بھی کیا گیا تھا کہ جماعت کا اجتماع عام ہر سال کیا جاتا رہے گا، لیکن محض اس وجہ سے کہ جنگی حالات نے مجبور کر دیا تھا گذشتہ پونے چار سال سے ہم کوئی اجتماع عام نہ کر سکے۔ اگرچہ اس دوران میں حلقہ وار اجتماعات کیے جاتے رہے اور ان کی رپورٹیں بھی شائع ہوتی رہیں جن سے ایک بڑی حد تک جماعت کو زندگی کی وہ حرکت اور عمل کے لیے وہ روشنی ملتی رہی جس کے لیے اجتماع عام کی ضرورت ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود اجتماع عام بہرحال ضروری تھا اور حلقہ وار اجتماعات اس کی جگہ نہیں لے سکتے تھے۔ اسی وجہ سے مجھے آخر کار یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ جنگی مشکلات خواہ کتنی ہی ہوں اور لوگوں کو دور دراز سے آنے میں خواہ کتنی ہی زحمتیں برداشت کرنی پڑیں اب یہ اجتماع ضرور منعقد ہو جانا چاہیے۔

میں آپ حضرات کا بہت شکر گذار ہوں کہ آپ میری طرف سے دعوت کی ایک ہی صدا سن کر ہندوستان کے مختلف گوشوں سے موجودہ زمانے کے پرصعوبت سفر کی تکلیفیں برداشت کرتے ہوئے یہاں جمع ہو گئے۔ اس طرح میری آواز پر لبیک کہہ کر آپ نے میری

طاقت میں بھی اضافہ کیا اور اپنی طاقت میں بھی۔ ایسا نہ کرتے تو میں اپنی جگہ کمزور ہوجاتا اور آپ اپنی۔ اور نتیجہ یہ ہوتا کہ ہماری یہ تحریک جو ایک بہت بڑے عزم کا اظہار ہے، خود بخود ٹھٹھر کر رہ جاتی۔ آپ جب کسی شخص کو کسی مقصد عظیم کے لیے خود اپنا امیر بناتے ہیں تو اس کی اطاعت کرکے در اصل اپنی ہی طاقت کو مضبوط کرتے ہیں۔ جس قدر زیادہ آپکے اندر انانیت و خود پسندی ہوگی اور جتنی کم اطاعت کا اظہار آپسے ہوگا اتنا ہی آپ کا اپنا بنایا ہوا امیر کمزور ہوگا اور اسی قدر اس کی کمزوری کی وجہ سے آپ کی جماعتی طاقت ضعیف ہوگی، اور اس کے برعکس جس قدر زیادہ آپکے قلب و دماغ پر اپنے مقصد کا عشق حاوی ہوگا اور اُس عشق میں جتنا زیادہ آپ اپنی خودی کو فنا کریں گے اور جتنی زیادہ اپنے مقصد کی خاطر اطاعتِ امر کا صدور آپسے ہوگا اسی قدر زیادہ آپ کا مرکز قوی ہوگا اور آپ کی جماعتی طاقت زبردست ہوگی۔ میں یہ دیکھ کر اکثر اپنی جگہ خوش ہوتا ہوں کہ ہماری اس جماعت میں شخصیت پرستی اور ذہنی غلامی موجود نہیں ہے بلکہ ہر شخص کے اندر اچھی خاصی نقادانہ نظر موجود ہے، اور سب سے بڑھ کر آپ کی تنقیدی نگاہیں خود میرے اوپر پڑتی ہیں، لیکن یہ خیال رکھیے کہ جتنی کڑی تنقیدی نگاہ آپ مجھ پر ڈالتے ہیں اور آپ کا فرض ہے کہ ایسا کریں اتنی ہی کڑی تنقیدی نگاہ میں بھی آپ پر ڈالتا ہوں اور میرا بھی یہ فرض ہے کہ ایسا کروں۔ آپکے امر کی اطاعت اور ضابطے کی پابندی اور رضاکارانہ خدمت کی ادائیگی میں جتنی کمزوری ظاہر ہوتی ہے اتنا ہی میں اپنے آپ کو بے بس پاتا ہوں اور مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں ایسی بندوقوں سے کام لے رہا ہوں جو لبلبی دبانے پر بھی فائر نہیں کرتیں۔ اور ظاہر ہے کہ ایسے ہتھیاروں کو لے کر کون ایسا نادان ہوگا جو کسی بڑے اقدام کا ارادہ کر بیٹھے۔ برعکس اس کے جب میں آپکے اندر اطاعت اور تطوع اور باضابطگی کے اوصاف پاتا ہوں اور یہ دیکھتا ہوں کہ ایک آواز پر آپ جمع کیے جاسکتے ہیں، ایک اشارے پر آپ حرکت کر سکتے ہیں اور خود اپنے دل کی لگن سے آپ اس کام کو کرتے رہتے ہیں جو آپ کے سپرد کیا جائے تو میرا دل قوی اور میری ہمت بلند ہونے لگتی ہے اور میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ اب مجھے وہ طاقت حاصل ہورہی ہے جس سے میں اس مقصد عظیم کے لیے کچھ زیادہ کام کرسکوں۔

اب میں اس افتتاحی خطاب میں وہ چند باتیں مختصر طور پر آپ سے کہہ دینا چاہتا ہوں جنھیں آغاز میں بیان کرنے کی ضرورت ہے:

(۱) آپکے اجتماعات میں خواہ کتنا ہی بڑا مجمع ہو مگر خیال رکھیے کہ بھیڑ اور ہڑبونگ اور شور و ہنگامہ کی کیفیت کبھی رونما نہ ہونی چاہیے۔ اگرچہ اس طرح کی کوئی چیز ابھی تک میں نے محسوس نہیں کی ہے مگر پھر بھی آپ کو اس طرف توجہ دلانے کی ضرورت ہے۔ جو کام ہم نے اپنے ہاتھ میں لیا ہے، یعنی اخلاقی اصولوں پر دنیا کی اصلاح کرنا اور دنیا کے نظم کو درست کرنا۔ اس کا تقاضا ہے کہ اخلاقی حیثیت سے ہم اپنے آپ کو دنیا کا صالح ترین گروہ ثابت کر دکھائیں۔ جس طرح ہمیں دنیا کے موجودہ بگاڑ پر تنقید کرنے کا حق ہے اسی طرح دنیا کو بھی یہ دیکھنے کا حق ہے کہ ہم انفرادی طور پر اور اجتماعی طور پر کیسے رہتے ہیں، کیا برتاؤ کرتے ہیں، کس طرح جمع ہوتے ہیں اور کس طرح اپنے اجتماعات کا انتظام کرتے ہیں؟ اگر دنیا نے دیکھا کہ ہمارے اجتماعات میں بدنظمی ہے، ہمارے مجموں میں انتشار اور شور و غل ہوتا ہے، ہمارے رہنے اور بیٹھنے کی جگہیں بدسلیقگی کا منظر پیش کرتی ہیں، جہاں ہم کھانے بیٹھتے ہیں وہاں آس پاس کا سارا ماحول غلیظ اور گندہ ہوجاتا ہے اور جہاں ہم مشورے کے لیے جمع ہوتے ہیں وہاں ٹھٹھے اور مذاق اور قہقہے اور جھگڑے برپا ہوتے ہیں اور بے قاعدہ حرکات کی نمائش ہوتی ہے تو دنیا ہم سے اور ہمارے ہاتھوں ہونے والی "اصلاح" سے خدا کی پناہ مانگے گی اور یہ محسوس کرے گی کہ اگر کہیں زمین کا انتظام ان لوگوں کے ہاتھ میں آگیا تو یہ ساری زمین کو ویسا ہی کرکے چھوڑیں گے

جیسے یہ خود ہیں۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ آپ اپنے اجتماعات کے دوران میں نظم، باقاعدگی، سنجیدگی و وقار، صفائی و طہارت اور حسن اخلاق اور خوش سلیقگی کا ایسا مکمل مظاہرہ کریں جو دنیا میں نمونہ بن سکے۔ آپ کے ہاں خواہ ہزاروں آدمی جمع ہوں لیکن کوئی شور و غل برپا نہ ہونے پائے کسی طرف غلاظت اور گندگی نہ پھیلے، کسی قسم کے نزاعات اور جھگڑے نہ برپا ہوں، کہیں بھیڑ اور بھگدڑ کی کیفیت نظر نہ آئے۔ ایک منظم گروہ کی طرح اٹھیے اور بیٹھیے اور کھائیے اور جمع ہو جیے اور منتشر ہو جائیے۔ آپ میں سے جن لوگوں نے حدیث کا مطالعہ کیا ہے انھوں نے دیکھا ہوگا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لحاظ سے اپنی جماعت کو کتنا سنجیدہ، باوقار، مہذب اور منضبط بنایا تھا اور اسلامی جماعت کے پھیل جانے میں اس کیفیت کا کتنا بڑا دخل تھا۔ ایک طرف مشرکین عرب کا یہ حال تھا کہ ان کا ایک چھوٹا سا دستہ بھی اگر کسی علاقے سے گذر جاتا تھا تو شور محشر برپا ہو جاتا، دوسری طرف صحابۂ کرام کا یہ حال تھا کہ ان کے بڑے سے بڑے لشکر بھی منزلوں پہ منزلیں طے کرتے چلے جاتے تھے اور کوئی ہنگامہ برپا نہ ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ جہاد میں صحابہ کرام نے صورت حال سے متاثر ہو کر اللہ اکبر کے نعرے بلند کیے تو حضور نے فرمایا کہ جس کو تم پکار رہے ہو وہ بہرہ نہیں ہے۔ یہی باوقار رویہ تھا جس کی تربیت دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب فتح مکہ کے موقع پر دس ہزار کا لشکر لے کر چلے تو اہل مکہ کو اس وقت تک کانوں کان آپ کے آنے کی خبر نہ ہو سکی جب تک کہ آپ نے خود ہی ان کے عین سر پر پہنچ کر آگیں روشن کرنے کا حکم نہ دیا۔ اسی روش کی تقلید ہمیں بھی کرنی چاہیے اور ہمارے اجتماعات میں بھی زیادہ سے زیادہ اسی شان کی جھلک نظر آنی چاہیے۔

(۲) دوسری بات جو میں آپ کے اجتماعات کی خصوصیت دیکھنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ جہاں آپ جمع ہوں وہاں دیانت و امانت بالکل ایک محسوس و مشہود شکل میں نظر آنی چاہیے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہاں کسی شخص کو اپنے سامان کی حفاظت کے لیے کسی اہتمام کی ضرورت پیش نہ آئے۔ جس کا مال اور سامان جہاں رکھا ہو وہاں بغیر کسی نگراں اور محافظ، اور قفل اور کنجی کے محفوظ پڑا رہے۔ کسی کی چیز جہاں گری ہو وہیں وہ اس کو آکر پائے، اور اگر کہیں کوئی دکان یا اسٹال ہو تو فروخت کنندہ کے بغیر اس کا مال ٹھیک ٹھیک فروخت ہو، جو شخص کوئی چیز لے وہ ٹھیک حساب سے اس کی قیمت وہیں رکھ دے خواہ بیچنے والا وہاں موجود ہو یا نہ ہو۔

(۳) تیسری بات آپ کی جماعت کے منصب امارت سے متعلق ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ جب جماعت بنی تھی اور آپ نے مجھے امیر منتخب کیا تھا تو میں نے آپ کے مطالبے کے بغیر خود یہ وعدہ کیا تھا کہ ہر اجتماع عام میں میں یہ اعلان کرتا رہوں گا کہ اگر اب آپ کو کوئی مجھ سے اہل تر آدمی مل گیا ہو تو میں جگہ خالی کرنے کے لیے تیار ہوں، آپ اس کو امیر منتخب کر لیں۔ چونکہ اس کے بعد کوئی اجتماع عام منعقد نہ ہوا اس لیے میں اپنے اس وعدے کو بھی پورا نہ کر سکا۔ آج یہ پہلا اجتماع ہے اور میں اپنے وعدے کے مطابق یہ اعلان کرتا ہوں۔ میں یہ تو ضرور چاہتا ہوں کہ کوئی دوسرا شخص اس منصب کو سنبھالے اور میں اس کی اطاعت کر کے بتاؤں کہ امیر کی اطاعت کس طرح کرنی چاہیے، مگر میرے اس اعلان کے معنی یہ نہ لیے جائیں کہ میں خود پیچھے ہٹ رہا ہوں اور اس کام کو انجام دینے سے جی چرانا چاہتا ہوں۔ میرا مدعا صرف یہ ہے کہ نہ میں اس منصب کا خواہشمند ہوں، نہ کسی اہل تر آدمی کے آنے میں مانع ہوں اور نہ اپنی ذات کو اس تحریک کی ترقی اور اس جماعت کی بہتری کی راہ میں روڑا بنانا چاہتا ہوں۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا اور آج بھی کہتا ہوں کہ اگر کوئی اس کام کو انجام دینے کے لیے آگے نہ بڑھے گا تو میں بڑھوں گا اور اپنی نااہلی کے جاننے کے باوجود اس کے لیے تیار ہوں کہ نہ میں کام کروں اور نہ کوئی اور۔ لہٰذا جب تک مجھے خود کوئی اہل تر آدمی نہیں ملتا اور جب تک آپ بھی کسی موزوں تر آدمی کو نہیں پاتے اس وقت تک میں اس کام کو کرتا رہوں گا اور خواہ مجھے کیسی ہی زحمتیں اور تکلیفیں اٹھانی پڑیں بہرحال اس جھنڈے کو میں خود اپنے ہاتھ سے نہ چھوڑوں گا۔

اس کے ساتھ میں یہ اعلان بھی کر دینا چاہتا ہوں کہ پچھلے تین سال کے دوران میں اگر کسی کو مجھ سے کوئی شکایت پیدا ہوئی ہو، کسی کا حق ادا کرنے میں یا کسی کے ساتھ انصاف کرنے میں مجھ سے کوئی کوتاہی ہوئی ہو یا کسی نے میرے کام میں کوئی غلطی پائی ہو تو بے تکلف اس کا اظہار کرے، خواہ شخصی طور پر میرے سامنے، خواہ پوری جماعت کے سامنے۔ میں کسی شکایت کے پیش ہونے میں کوئی رکاوٹ ڈالوں گا، نہ اپنی کسی غلطی یا قصور کے اعتراف میں مجھے کوئی باک ہوگا اور نہ اپنی اصلاح میں یا کسی جائز شکایت کی تلافی میں ذرہ برابر تامل کروں گا۔ البتہ اگر کوئی شکایت کسی غلط فہمی پر مبنی ہوگی تو اسے صاف کر دوں گا تاکہ اس کام میں میرے اور رفقاء جماعت کے درمیان تکدر باقی نہ رہے۔"

اس افتتاحی تقریر کے بعد امیر جماعت نے قیم جماعت کو اپنی رپورٹ پیش کرنے کا حکم دیا اور انھوں نے تشکیل جماعت سے لے کر اس اجتماع تک کی روداد جماعت پیش کی جو درج ذیل ہے۔

روداد جماعتِ اسلامی از ابتدائے تشکیل جماعت تا ۱۶ اپریل ۴۵ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ الحمد للہ رب العلمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہ الکریم۔

امیر جماعت، رفقاء محترم اور معزز حاضرین! آپ کو معلوم ہے کہ ہمارا نصب العین اور واحد مقصد زندگی اس دنیا میں حکومت الٰہیہ کے قیام کی سعی اور آخرت میں رضائے الٰہی کا حصول ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنی انفرادی یا اجتماعی، سیاسی یا تمدنی، معاشی یا کسی دوسری حیثیت میں بھی سوائے اپنے رب اور الٰہ واحد کے اور کسی کا بندہ بن کر نہ رہے بلکہ اپنی پوری کی پوری زندگی اور اس کے سارے معاملات اطاعت الٰہی میں دیدے اور ساتھ ہی ساتھ دوسرے انسانوں کو بھی یہی راہ عملاً اختیار کرنے کے لیے آمادہ کرے، کیونکہ بندگی کا تقاضا یہی ہے اور دنیا میں امن و سلامتی اور آخرت میں فوز و کامیابی کی یہی ایک واحد راہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیے کہ ہم وہی مقصد اور وہ دعوت لے کر اٹھے ہیں جو آدم علیہ السلام سے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیاء کرام لیکر دنیا میں تشریف لاتے رہے ہیں۔ اس راہ کو ہم نے کسی بدعت پسندی یا محض ایک نئی تحریک چلانے کے لیے اختیار نہیں کیا بلکہ اس لیے کیا ہے کہ اللہ کی الوہیت (لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ) اور محمدؐ کی رسالت (محمد رسول اللہ) کے اقرار کے معنی ہی اس راہ کو عملاً اختیار کرکے چل پڑنے کے ہیں۔ کلمۂ طیبہ کا اقرار اور اقامت دین کی جد و جہد سے انحراف ایک دوسرے کی عین ضد ہیں۔

اس دعوت کو عملاً لے کر اٹھنے، اسے اپنے دوسرے بھائیوں تک پہنچانے اور اس سے متاثر حضرات کو سمیٹنے اور جذب کرنے کا صحیح اور بہترین طریقہ یقیناً وہی ہو سکتا ہے جو ابتدا سے آخر تک اس دعوت کے اصل علمبردار یعنی انبیاء کرام اللہ تعالیٰ کی رہنمائی میں اختیار کرتے رہے۔ قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ وہ طریقہ ایک ہی ہے اور وہی ایک طریقہ بلا استثناء ہر زمانے میں اختیار کیا جاتا رہا ہے۔ چنانچہ اسی طریقہ کار کو ہم نے اختیار کیا ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ اس ایک دعوت اور طریق کار کے علاوہ دوسری تمام دعوتیں اور طریقہائے کار سراسر باطل ہیں۔ ہم اپنے عمل کے لحاظ سے تو کسی بلندی و بزرگی کے مقام پر فائز ہونے کا دعویٰ نہیں رکھتے، مگر اس کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ قائم ہے کہ ہم اپنی اس دعوت، اس کے مقتضیات و مطالبات اور اس کے طریق کار کے لیے انبیاء علیہم السلام

ہی کی پیروی و قائم مقامی کرنے کا داعیہ رکھتے ہیں اور ہمارا مسلک یہی ہے کہ ان تمام امور میں اپنے عقل و فہم کی حد تک ہر معاملے اور ہر مرحلے پر کتاب و سنت ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ان چیزوں میں سے کسی پر پورا نہ اترنا ہماری بشری کمزوری، کم علمی اور نادانی کا نتیجہ تو ہو سکتا ہے لیکن دیدہ دلیری، ڈھٹائی، تعصب اور خدا و رسول کے سوا کسی غیر کی عقیدت مندی کا نتیجہ نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے جماعت کے اندر اور باہر سب انسانوں پر ہم اپنا یہ حق سمجھتے ہیں کہ اگر وہ ہم میں یا ہم میں سے کسی میں کوئی کجی یا قابل اعتراض بات پائیں یا محسوس کریں تو اسے فتنے کا ذریعہ بنانے کے بجائے خاموشی کے ساتھ بلا مبالغہ اور بلا طعن و تشنیع اپنے کمزور بھائی یا بھائیوں پر اس کو واضح کر دیں اور برادرانہ نرمی اور ہمدردی سے اسے دور کرنے کی کوشش کریں۔ اَلْمُسْلِمُ مِرْاٰۃُ الْمُسْلِمِ کا یہی مطلب ہے۔

ہماری اس دعوت اور طریق کار کا یہ فطری تقاضا ہے کہ اس میں دکھاوے یا نمائش یا مبالغے کی کوئی جھلک بھی نہ پائی جائے کیونکہ یہ چیزیں عمل صالح کو اسی طرح ضائع کر دیتی ہیں جس طرح دودھ کو کھٹائی ضائع کر دیتی ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں ریا اور نمائش کے جذبات سے محفوظ رکھے۔ اس کے علاوہ چونکہ اس زمانہ میں نمائش اور مبالغہ اور مظاہرہ تقریباً ہر تحریک کے اٹھانے اور چلانے کا لازمی ذریعہ بن گئے ہیں اور ماحول کے اس ہمہ گیر اثر سے ہمارے رفقاء کا متاثر ہونا بعید نہیں ہے اس لیے بھی ہم اس سلسلے میں بہت زیادہ محتاط رہتے ہیں اور اپنے اجتماعات تک کی کارروائیوں کو بلا اشد ضرورت کے شائع نہیں کرتے اور وہ بھی صرف اپنے ارکان اور ہمدردوں ہی کے درمیان محدود رکھتے ہیں۔

لیکن یہ بھی ایک امر واقعہ ہے کہ اگر ارکان اور ہمدردانِ جماعت تحریک کی رفتار سے وقتاً فوقتاً مطلع نہ ہوتے رہیں تو ایک عام جمود، بددلی اور مایوسی طاری ہو جانے کا قوی احتمال پیدا ہو جاتا ہے خصوصاً اس مرحلے پر جبکہ جماعت اور ارکان سب کے سب ابتدائی حالت میں ہیں، نظام باطل اپنے پورے قہر و غلبہ کے ساتھ پوری دنیا پر مسلط ہے اور ہمارے ارباب علم و فضل کا وہ مختصر اور منتشر گروہ بھی، جسے اس عالمگیر تاریکی کے زمانہ میں امتِ وَسَط اور شہداء اللہ کے فرائض سرانجام دینے چاہیے تھے، دعوت حق میں شریک ہونے کے بجائے اہل باطل اور فساق و فجار کی قیادت و رہنمائی میں نہ صرف اپنے جان و مال اور دل و دماغ کی قوتیں ہی ضائع کر رہا ہے بلکہ عامۃ المسلمین کی گمراہی و ضلالت اور فسق و فجور کا بار بھی اپنے سر پر لے رہا ہے، اگر ارکان جماعت اور ہمدردوں کو وقتاً فوقتاً تحریک کی رفتار سے باخبر نہ کیا جاتا رہے تو وہ ایسا محسوس کرنے لگتے ہیں کہ شائد جماعت میں کچھ ہو ہی نہیں رہا ہے اور اس سے ایک عام سرد مہری اور افسردگی چھا جاتی ہے۔ اس لیے اجتماعات کے مواقع پر ارکان اور ہمدردانِ جماعت کو کام کی رفتار سے آگاہ کرنا ضروری ہے۔ اس سے صرف یہی فائدہ نہیں کہ مرکز سے دور رہنے والے رفقاء جماعت کی کارروائیوں سے مطلع ہو جاتے ہیں بلکہ یہ فائدہ بھی ہوتا ہے کہ رفقاء اور ہمدردوں کو ہمارے کام پر تنقید کرنے کا موقع ملتا ہے اور ہمیں ان کے نیک اور مفید مشوروں سے مستفید ہونے کا۔ چنانچہ اسی مقصد کے لیے اب میں تشکیل جماعت سے اب تک کی جماعت کے کام کی مختصر رپورٹ پیش کرتا ہوں کیونکہ تشکیل جماعت کے بعد پوری جماعت کا یہ پہلا ہی اجتماع عام منعقد ہو رہا ہے۔

تشکیل جماعت

"جماعت اسلامی" کی تشکیل ۳ر شعبان ۱۳۶۰ھ مطابق ۲۶ر اگست ۱۹۴۱ء کو ہوئی اس کے متعلق مفصل معلومات "رودادِ جماعت اسلامی" حصہ اول میں موجود ہیں۔ تشکیل جماعت کے وقت اس میں شریک ہونے والے حضرات کی کل تعداد صرف ۷۵ تھی۔ دو تین سال کے اندر ہی یہ تعداد بڑھتے بڑھتے ساڑھے سات سو تک پہنچ گئی۔ لیکن شعبہ تنظیم کے باقاعدہ قائم نہ ہو سکنے کی وجہ سے ارکان اور مرکز

کے درمیان کسی خاطر خواہ ربط کا انتظام نہ ہو سکا اور نہ ہی امیر جماعت یا دوسرے ذمہ دار کارکنوں کو ارکان کی جانچ پڑتال اور نگرانی کے کوئی تسلی بخش ذرائع میسر آ سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے ایسے لوگ جماعت میں شریک ہو گئے جن کو اب ہم غالباً اپنے قریبی ہمدردوں میں بھی شریک نہ کر سکیں۔

"شعبۂ تنظیم" قائم نہ ہو سکنے کی وجہ ایک تو کارکنوں کی قلت تھی اور دوسرے جماعت کی مالی حالت کی کمزوری۔ تقریباً انہی دو وجوہ سے یہ سلسلہ اسی طرح پونے تین سال تک چلتا رہا۔ آخرکار گذشتہ سال جب ۲۶، ۲۷ مارچ ۱۹۴۴ء کو صوبہ پنجاب، سندھ، سرحد، کشمیر اور بلوچستان کے ارکان جماعت کا اجتماع یہاں دار الاسلام میں منعقد ہوا تو شعبۂ تنظیم کے باقاعدہ قیام کی ضرورت کو مختلف جماعتوں اور ارکان کی طرف سے بڑے زور سے پیش کیا گیا اور امیر جماعت نے بھی فرمایا کہ وہ اس ضرورت کو ابتدا ہی سے محسوس کر رہے ہیں۔ چنانچہ یہ تجویز منظور ہو کر شعبۂ تنظیم کے باقاعدہ قیام کا فیصلہ ہو گیا اور ۱۷ اپریل ۱۹۴۳ء کو یہ شعبہ عملاً قائم کر دیا گیا۔

مقامی جماعتوں اور ارکان کی تعداد

شعبۂ تنظیم کے قیام کے وقت سارے ملک میں مقامی جماعتوں کی تعداد ۳۰ تھی جن میں سے چند جماعتیں جماعتی نقطۂ نظر سے صفر ہو چکی تھیں اور انھیں بعد میں ختم ہی کر دینا پڑا۔ ملک کے مختلف حصوں میں ارکان کی تعداد اندازاً سات سو پچاس تھی، مگر ان کے باقاعدہ اندراج کا کوئی انتظام نہ تھا۔ نیز ان جماعتوں اور منفرد ارکان میں کافی تعداد ایسے لوگوں کی بھی بھرتی ہو گئی تھی جنھوں نے محض جماعتی لٹریچر کی پسندیدگی یا محض نصب العین سے نظری اتفاق ہی کو رکنیت کے لیے کافی سمجھ رکھا تھا، یا پھر جنھوں نے اس سے کچھ زائد بھی سمجھا تھا تو وہ مرکز کے ساتھ ربط کا کوئی مستقل ذریعہ نہ ہونے کی وجہ سے سرد پڑتے پڑتے بالکل ابتدائی سطح پر پہنچ گئے تھے۔

شعبۂ تنظیم کے قائم ہونے پر مقامی جماعتوں اور ارکان کی جانچ پڑتال شروع ہوئی۔ چنانچہ ایک سال کی مسلسل کاٹ چھانٹ کے بعد اب ارکان کی مجموعی تعداد ساڑھے چار سو سے بھی کم رہ گئی ہے اور ابھی اس چھانٹ کا سلسلہ جاری ہے۔ بعض جماعتوں کو بھی ان کی سرد مہری اور کم سے کم جماعتی اوصاف اور معیارِ کارکردگی سے نیچے گر جانے کی وجہ سے توڑ دینا پڑا۔ الحمد للہ کہ اس کے باوجود مقامی جماعتوں کی تعداد ۳۰ سے بڑھ کر ۳۵ ہو گئی ہے۔

یہ سب ہم نے اس لیے کیا کہ ہمارے پیش نظر کوئی بھیڑ جمع کر کے دوسروں کو مرعوب کرنا یا کسی کونسل یا کارپوریشن میں اپنی نشستوں میں اضافہ کروانا نہیں ہے بلکہ کچھ ایسے مردانِ کار تیار کرنا ہے جو اہل دنیا کو مسلمانوں کی طرح جینا اور مرنا سکھا سکیں اور ان بزرگوں اور عوام کو جو یہ کہتے ہیں کہ اس زمانے میں اسلامی نظام زندگی ممکن العمل نہیں ہے، بتا دیں کہ نظام اسلامی ہمیشہ کی طرح اب بھی ممکن العمل ہے صرف عزم اور ایمان کی ضرورت ہے۔

یقین رکھیے کہ جس قسم کے کارکن ہم تیار کرنا چاہتے ہیں اور جس قسم کی تربیت ان کے لیے ضروری ہے اس کے لیے یہ تعداد بھی بہت زیادہ ہے اور اپنے موجودہ ذرائع اور سٹاف کے ساتھ ہم اس تعداد ارکان کے ساتھ بھی وہ ربط اور قریبی تعلق پیدا نہیں کر سکتے جو اس بارے میں ہونا چاہیے۔ ہمیں تو اپنے حلال خور سے لے کر امیر جماعت تک سب کے سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے اور ایک ہی جنون رکھنے والے کارکن درکار ہیں، اس لیے ہمیں بہت احتیاط سے ارکان کو لینا اور جماعت میں رکھنا ہے۔

یہ ضرور ہے کہ جو لوگ ہم سے ایک مرتبہ وابستہ ہو جائیں ہم آخری حد تک اور پوری ہمدردی اور برادرانہ شفقت کے ساتھ ان کو اپنے

ساتھ لگائے رکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کی کمزوریوں اور خامیوں کو بھی تا حد امکان حکیمانہ طور پر دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن جب یہ معلوم ہو جائے کہ اب اصلاح کی توقع نہیں رہی یا وہ کم سے کم معیارِ رکنیت جماعت سے بھی نیچے گر گئے ہیں تو ہم انھیں اسی حسرت و تکلیف کے ساتھ الگ کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں جس طرح کسی عضو جسمانی کے سڑ جانے پر باقی جسم کی حفاظت و بقا کے لیے ہر ہوشمند انسان اسے کٹوا دینے پر راضی ہو جاتا ہے۔ ان حالات میں بھی ہمارا قاعدہ یہ ہے کہ ہم ایسے اصحاب کو از خود علیحدگی اختیار کرنے کا مشورہ دیتے ہیں اور اب تک تقریباً سارے کے سارے لوگ اسی طریقہ سے الگ ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں سے شاذ ہی کوئی ایسا ہو جسے اپنی خامی یا کمزوری کا احساس نہ ہو اور رکنیت سے علیحدگی اختیار کرنے کے باوجود اب ہمارے قریبی حلقۂ ہمدرداں میں شامل نہ ہو۔

مقامی جماعتوں اور ارکان کی عام حالت

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے ارکان کی موجودہ تعداد سوا چار سو [۴۲۵] اور ساڑھے چار سو [۴۵۰] کے درمیان ہے اور جماعتوں کی کل تعداد ترپن [۵۳] ہے۔ ان میں سے نصف سے زائد ارکان اور جماعتیں اس درجہ پختہ ہیں کہ کسی نہ کسی حد تک وہ خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکتے ہیں اور اگر مہینوں انھیں چھوڑ دیا جائے تو وہ خود بخود اپنی ذمہ داری پر کام کرتے رہتے ہیں، لیکن پھر بھی وہ معیارِ مطلوب سے ابھی بہت دور ہیں اور توقع نہیں کہ ان میں سے کوئی بھی پاور ہاؤس تو کیا ایک سب اسٹیشن کا کام بھی دے سکے۔ ہر رکن اور جماعت کو زیادہ سے زیادہ اس طرف توجہ کرنی چاہیے کہ وہ اپنی جگہ پر خود کافی (self sufficient) ہو کر کام کر سکے۔

اب کیسے لوگوں کو اور کس طرح جماعت میں شریک کیا جاتا ہے؟

تحریک کے اس مرحلے پر ہمارے پیش نظر ایسے لوگوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد کو اپنے ارکان اور ہمدردوں میں جذب کر لینا ہے جو صحیح معنوں میں سوسائٹی کا مکھن (Cream of The Society) کہلا سکتے ہوں ---- مادی یا دنیاوی وجاہت کے لحاظ سے نہیں بلکہ دینی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے۔ اس وقت ہمیں خاص طور پر ایسے لوگوں کی تلاش ہے جو خدیجۃ الکبریٰؓ اور صدیق اکبرؓ کی طرح اس دعوتِ حق کو سنیں اور سراپا اس میں شریک ہو جائیں گویا کہ اب تک اسی کی وہ تلاش میں تھے۔

چنانچہ اب کسی کو جماعت میں شریک کرنے سے پہلے حسب ذیل امور کے متعلق خاص طور پر تسلی کر لینے کی کوشش کی جاتی ہے۔

(۱) یہ کہ انھوں نے ہماری دعوت اور اس کے طریق کار کو، اور دوسری دعوتوں کو جو ہندوستان میں چل رہی ہیں اور ان کے طریق کار کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے اور وہ ان دونوں کے فرق کو سمجھ کر ہماری طرف کھنچ رہے ہیں۔

(۲) یہ کہ انھوں نے ہماری دعوت سے متاثر ہو کر اخلاقی اور دینی حیثیت سے کوئی نمایاں ترقی کی ہے اور ان کی عملی زندگی پر اس کا نقش صاف طور پر محسوس ہوتا ہے۔

(۳) یہ کہ اس معاملے میں ان کا رویہ (Attitude) منفعلانہ (Passive) نہ ہو بلکہ فاعلانہ (Active) ہو اور وہ اس دعوت کا کام کرنے کے لیے عملاً بے چین نظر آتے ہوں۔

ان چیزوں کا اطمینان کر لینے کے بعد بھی عموماً کئی کئی ماہ ان کو امیدواری کی حالت میں رکھا جاتا ہے اور ان سے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو رکن جماعت سمجھتے ہوئے کچھ مدت تک کام کریں۔ اس طرح ان کا کام دیکھنے کے بعد ان کو رکن بنانے کا فیصلہ کیا جاتا ہے تاکہ اگر ان کا اثر محض وقتی اور ہنگامی ہو تو وہ جماعت کے اندر آ کر اس کے نظم کو خراب نہ کریں۔

یہی طریقہ ہمارے مقامی ارکان اور جماعتوں کو بھی اختیار کرنا چاہیے۔

ارکان اور ہمدردوں سے کام لینے کا طریقہ

اس وقت ہمارا سارے کا سارا کام رضاکارانہ ہو رہا ہے یعنی کسی سے کوئی کام حکماً نہیں کروایا جاتا بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ ایک شخص اس دعوت سے اپنے دلی لگاؤ کی بنا پر اور تجدید ایمان سے اپنے اوپر عائد شدہ ذمہ داریوں کے احساس سے مجبور ہو کر کیا اور کس قدر کام کرتا ہے۔ البتہ بلاواسطہ (Indirect) طریق سے مقتضیات ایمان کو اجاگر کرنے اور ادائے شہادت کی ذمہ داریوں کا شعور پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے۔ اس طریقے کے بہت سے فائدے ہیں۔ اولاً یہ کہ اس سے کارکنوں کے اندر غلامانہ ذہنیت کے بجائے داعیانہ جذبات پرورش پاتے ہیں جو ہر انقلابی تحریک کے علمبرداروں کے لیے اساسی اہمیت رکھتے ہیں اگر کسی ایسی تحریک کے کارکنوں میں یہ پیدا نہ ہوں تو اس کا کامیاب ہونا تو درکنار زیادہ عرصہ زندہ رہنا بھی ممکن نہیں۔ ثانیاً یہ کہ اس سے ارکان اور ہمدردوں میں اخلاقی اور دینی تغیر کی رفتار ہر وقت معلوم ہوتی رہتی ہے اور امیر جماعت کو جماعت کی صحیح قوت اور صلاحیت کا ہر آن ٹھیک اندازہ رہتا ہے۔ ثالثاً یہ کہ اس سے مختلف ارکان کی درجہ بندی اور ان کی دعوت سے وابستگی کے اندازہ کے لیے کسی لمبی چوڑی تحقیقات کی ضرورت نہیں رہتی بلکہ اس بارے میں سارے مدوجزر مسلسل سامنے آتے رہتے ہیں۔

اپنے ہمدردوں کی ہمدردی کا اندازہ بھی ہم ان کے زبانی دعووں سے نہیں بلکہ دعوت کے لیے ان کے کام اور جان، مال اور وقت کے ایثار سے ہی کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جس شخص کو اپنے "مسلمان" ہونے کا شعور ہو جائے اور وہ جان لے کہ انبیاء علیہم السلام کا جانشین ہونے کی حیثیت سے دعوت حق کو لوگوں تک پہنچانے کی کتنی بڑی ذمہ داری اس کے سر پر ہے اس کے لیے آرام سے بیٹھ رہنا ممکن ہی نہیں رہتا۔ اور جو اس کے بعد بھی بیٹھا رہتا ہے وہ خود ہی اپنا بے شعور یا ناکارہ ہونا ثابت کر دیتا ہے۔

جماعت کا حلقۂ اثر

ہماری آواز پنجاب کے تقریباً ہر گوشہ میں پہنچ گئی ہے حیدرآباد (دکن) اور مدراس کے بیشتر علاقوں میں اور یوپی اور بہار کے متعدد علاقوں میں پہنچ چکی ہے۔ ان کے بعد بمبئی، سندھ، اور صوبہ سرحد کا نمبر آتا ہے۔ صوبہ بنگال میں اب کلکتہ اور اس کے مضافات میں کچھ لٹریچر جانے لگا ہے۔ کلکتہ میں اب تاجران کتب بھی ہمارا لٹریچر منگوا رہے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عام پبلک میں اس کی مانگ پیدا ہو رہی ہے۔ اڑیسہ، وسط ہند، آسام اور بلوچستان میں اس وقت تک ہمارا کام تقریباً صفر کے برابر ہے۔ کہیں کہیں کوئی شخص اکا دکا کوئی کتاب یا رسالہ منگوا لیتا ہے ورنہ بحیثیت مجموعی یہ سب علاقے ہماری دعوت کے لحاظ سے تا حال بالکل بنجر ہیں۔

بنگال، سندھ، اور جنوبی ہند میں سب سے بڑی رکاوٹ زبان کی ہے کہ ان صوبوں میں اردو زبان جاری نہیں اور ان کی زبانوں میں ہم اب تک لٹریچر تیار نہیں کر سکے۔

اب جماعت کی طرف کیسے لوگ کھنچ رہے ہیں؟

جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے سنجیدہ اور سلیم الطبع لوگ بہت تیزی سے ہماری دعوت اور جماعت کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں اور ان میں سے جتنے لوگ بھی اب تک نکلے ہیں وہ بہت پختہ اور کارآمد ثابت ہو رہے ہیں۔ عربی درسگاہوں کے لوگ بھی اگرچہ اب ہماری طرف توجہ کرنے لگے ہیں لیکن ان میں سے ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو کسی نہ کسی کی عقیدت میں پھنسی ہوئی ہے اور ہر بات

کو برحق تسلیم کرلینے کے باوجود کسی حضرت صاحب میں اٹک کر رہ جاتی ہے۔ یہ چیز بھی میں نے اس ایک سال کے تنظیمی کام میں محسوس کی ہے کہ جس قدر جلدی اور آسانی سے یہ دعوت ایک جدید تعلیم یافتہ آدمی کو، جو طاغوتی نظام کے چکر میں پھنس کر بالکل چکرا نہ گیا ہو، اپیل کرتی اور اپنے اندر جذب کرلیتی ہے اس سے کئی گنا زیادہ دشواری عربی خواں حضرات کو اسے محض سمجھانے میں پیش آتی ہے، بلکہ ہمارے بعض دوستوں کو تو یہاں تک تجربہ ہوا ہے کہ دیہاتی کسانوں کے سامنے اس دعوت کو پیش کیا گیا اور وہ فوراً ہی اس کے انتہائی مقتضیات اور مطالبات کو پا گئے۔ لیکن اچھے اچھے ذی علم اصحاب قال اقول کے چکر ہی میں پڑے رہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمارے عربی خواں بھائی ایک تو براہ راست قرآن و حدیث سے دین اخذ کرنے کے بجائے بعض مخصوص رجال سے اپنا دین لینے کے خوگر بنا دیئے گئے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ساری کی ساری گروہی عصبیتوں اور شخصی عقیدتوں کو عین تقاضائے دینداری بنا کر اس طرح ان کے ذہن نشین کر دیا جاتا ہے کہ اس کے بعد وہ اپنے حلقے سے باہر کسی دینداری کے قائل ہی نہیں رہتے۔ اس کے برعکس جدید تعلیم یافتہ طبقہ اپنی ساری برائیوں اور مغرب زدگی کے باوجود یہ خوبی ضرور رکھتا ہے کہ بات کہنے والے منہ کے ساتھ ساتھ بات کے الفاظ و معانی پر بھی غور کرتا ہے اور پھر جب متوجہ ہوتا ہے تو اس یقین کے ساتھ کہ پہلے اس کے پاس جو کچھ تھا وہ غیر اسلام ہی تھا اور اب اسے اپنی پہلی زندگی کی عمارت کو سرتاپا اکھاڑ کر نئی بنیادوں پر تعمیر کرنا ہے۔

ہماری دعوت کے متعلق غیر مسلم حضرات کا تاثر

غیر مسلم اقوام میں اگرچہ ابھی ہم کوئی باقاعدہ کام کرنے کا انتظام نہیں کر سکے لیکن تھوڑا بہت لٹریچر جو اپنے زور سے ان کے اندر گھس رہا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر ہم صحیح طریق پر کام کرتے رہے تو ان شاء اللہ وہ تعصب جو غیر مسلموں اور مسلمانوں کے درمیان ایک مدت دراز تک دنیاوی اور مادی اغراض کے لیے کشمکش برپا رہنے سے پیدا ہو گیا ہے، ہماری راہ میں زیادہ حائل نہیں ہو سکے گا۔ اس امر میں تو اب کوئی شبہ نہیں رہا ہے کہ پوری دنیا اس وقت موجودہ نظامِ زندگی سے بری طرح بیزار ہو چکی ہے اور اپنے مصائب اور مادہ پرستی سے پیدا شدہ پیچیدگیوں کے حل کی تلاش میں بے تابی سے ہاتھ پاؤں مار رہی ہے۔ اس وقت اگر ہم کچھ صالح لوگوں کا ایسا جتھا تیار کرنے میں کامیاب ہو جائیں جو صحیح معنوں میں حق پرست اور خدا ترس بھی ہو اور دوسری طرف دنیا کے نظام کو چلانے کی صلاحیت اور قابلیت بھی موجودہ کارپردازوں سے بڑھ کر رکھتا ہو تو دنیا کو ان کی رہنمائی اور قیادت قبول کیے بغیر چارہ نہ ہوگا۔

ہمارا یہ ذاتی تجربہ ہے کہ جب بھی یہ دعوت عام لوگوں کے سامنے (خواہ وہ پیدائشی مسلمان ہوں یا غیر متعصب اور آزاد خیال غیر مسلم) صاف اور واضح الفاظ میں پیش کی گئی تو بے اختیار اس کے حق ہونے کا اعتراف کیا اور جیسا کہ قرآن کریم نے حق و ہدایت کو "ذکر" یعنی یاد دہانی کے نام سے موسوم کیا ہے۔ ان سب مواقع پر ہماری یہ دعوت سب سلیم الفطرت لوگوں کے لیے فی الواقع ان کے اپنے دل کی آواز اور ایک جانی بوجھی لیکن بھولی ہوئی حقیقت معلوم ہوئی۔ بلکہ غیر مسلم حضرات میں سے بعض ایسے بھی ملے جنھوں نے یہاں تک کہا کہ اے کاش ہندوستان میں یہی اسلام پیش کیا گیا ہوتا اور مسلمان اس پر چلے ہوتے تو آج ہندوستان کا کوئی دوسرا ہی نقشہ ہوتا۔ اور پھر انھوں نے ہمیں یہ بھی یقین دلایا کہ اگر آپ اپنی دعوت میں واقعی ثابت قدم رہے اور آپ نے ثابت کر دیا کہ آپ صرف حق پرست ہیں اور آپ کی اس سے کوئی ذاتی یا قومی غرض نہیں ہے تو موجودہ مسلمانوں

سے بڑھکر غیر مسلم اس میں شریک ہوں گے لیکن قومی اور نسلی تعصبات کی دیواریں گرنے میں وقت ضرور لگے گا۔

میں اپنے ان رفقاء سے جو غیر مسلم حلقوں میں بھی اثر و رسوخ رکھتے ہوں درخواست کروں گا کہ وہ اپنے پڑھے لکھے غیر مسلم بھائیوں میں "پردہ"، "ضبط ولادت"، "جبر و قدر"، "تنقیحات"، "معاشی مسئلہ" اور "سلامتی کا راستہ" وغیرہ کے ذریعے آہستہ آہستہ کام کا آغاز کریں۔

اسی سلسلے میں ہمارے دماغی صلاحیتیں رکھنے والے احباب کو اس امر کی طرف بھی توجہ کرنی چاہیے کہ ہندوستان کی موجودہ تاریخ کو، جو دراصل چند ترک اور افغان بادشاہوں اور ہندو راجاؤں کی باہم ملک گیری اور حصول دنیا کی کشمکش تھی مگر جسے اس طرح پیش کیا گیا ہے جیسے کہ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی قومی یا ہندو مذہب اور اسلام کی مذہبی جنگوں اور مناقشات کی پر درد داستان ہے، اور گویا کہ یہ ہندو راجہ ہندو مذہب کے تسلط کے لیے اور ترک اور افغان بادشاہ دین حق کی سربلندی اور اسلامی نظام زندگی کے نفاذ کے لیے باہم برسرپیکار رہے ہیں، از سرنو مرتب کیا جائے اور ان نقصانات کو واضح کیا جائے جو صحیح اسلام کی نعمت سے بہرہ ور ہونے کی بدولت ہندوستان کے باشندوں کو اٹھانے پڑے۔

موجودہ سیاسی جماعتوں پر ہماری دعوت کا اثر

ہماری دعوت کا اثر صرف مسلم و غیر مسلم افراد پر ہی نہیں پڑ رہا ہے بلکہ ملک کی پوری سیاسی فضا کسی نہ کسی حد تک اس سے متاثر ہو چکی ہے۔ ملک بھر کے پڑھے لکھے طبقے میں اب تھوڑے ہی ایسے لوگ ہوں گے جو "حکومت الٰہیہ" "قیام دین کی جد و جہد" "اسلامی نظام حیات" "اسلام ایک مکمل اور مستقل نظام زندگی ہے" وغیرہ الفاظ اور فقروں سے مانوس نہ ہوں۔ مسلمانوں میں تو یہ دعوت اس قدر مقبول ہو چکی ہے کہ فی الواقع اب ان میں کوئی ایسی تحریک یا جماعت فروغ نہیں پا سکتی جو کم از کم زبان سے قرآنی نظام زندگی کے قیام کو اپنا مقصد نہ بنائے حالانکہ اب سے پانچ چھ برس پہلے تک یہ حالت تھی کہ اس نام کو زبان پر لا کر کوئی شخص سیاسی حلقوں میں مضحکہ بنے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض جماعتوں نے تو خواہ زبانی طور پر ہی سہی، صاف صاف اس مقصد اور نصب العین کو اختیار کرنے کا اعلان کر دیا ہے، اور دوسری اس امر پر مجبور ہو گئی ہیں کہ اس طرف اپنے میلان کا اعلان کریں، اور مسلمانوں کو یقین دلانے کی کوشش کریں کہ آخر کار ان کے سامنے بھی یہی مقصود ہے۔

ہماری دعوت سے متاثر ہونیوالے احباب میں کس قسم کی اخلاقی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں؟

ہماری دعوت کا پہلا اثر جو اس سے متاثر ہونے والے لوگوں پر پڑتا ہے وہ یہ ہے کہ ان کی بے مقصد اور اندھے بھینسے کی سی زندگی کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور بامقصد اور سنجیدہ زندگی شروع ہو جاتی ہے۔ انھیں محسوس ہونے لگتا ہے کہ اس سے قبل انھوں نے کس طرح اپنے اصل مقصد زندگی کو بھلا کر حیوانوں کی طرح محض چرنے چگنے پر اپنی ساری مصروفیتوں اور وسائل کو مرتکز کر رکھا تھا۔ انھیں یہ چیز بری طرح کاٹنے لگتی ہے کہ کس طرح انھوں نے اپنی ان تمام قوتوں، قابلیتوں اور ذرائع و وسائل کو جو دراصل دین حق کی خدمت و سربلندی کے لیے عطا کیے گئے تھے خدمت نفس اور غلبۂ طاغوت کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ اس کے بعد ان کا معیار تقویٰ و خدا پرستی بھی سراسر بدل جاتا ہے اور جن لوگوں کی دینداری اور مذہبیت میں اس سے پہلے اونٹ تک نگل جانے سے کوئی فرق واقع نہ ہوتا تھا اس کے بعد ان کے لیے کسی دوسرے کی گز بھر زمین بھی بلا اجازت یا ناحق طور پر لینا ممکن نہیں رہتا۔ اس کے علاوہ دین اور مذہب کا

تصور چند مخصوص مراسم کی حد سے نکل کر پوری زندگی پر چھانے لگتا ہے اور ہر بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے معاملے میں مادی نفع ونقصان سے قطع نظر صرف خدا اور رسول کی پسند اور ناپسند ہی ایک معیار رد وقبول رہ جاتا ہے چنانچہ اب آخرت کی جوابدہی کا خیال ارکان کی زندگی کے ہر شعبے میں غالب آرہا ہے۔ حال کی بات ہے کہ ہمارے ایک رفیق جو ملازم ہیں ایم۔ اے کی تیاری کر رہے تھے۔ اس تیاری کے دوران میں انھوں نے محسوس کیا کہ ان کے ذہن میں اپنی طاغوتی ملازمت میں ترقی اور بڑے گریڈوں کے خیالات آنے شروع ہوگئے ہیں جو ناجائز اور ایمان کی عین ضد ہیں۔ چنانچہ اس اللہ کے بندے نے اسی بنا پر امتحان کا خیال ہی ترک کر دیا کہ مبادا اس کے بعد شیطان ان پر غلبہ حاصل کر کے کسی فریب میں مبتلا کر دے۔ یہ ایک واقعہ میں نے مثال کے طور پر عرض کیا ہے ورنہ خدا کے فضل سے اب ہمارے ارکان میں صحیح اسلامی تقوی پیدا ہو رہا ہے اور وہ اللہ کی مقرر کردہ حدود کی پاسداری کا اہتمام کرنے لگے ہیں۔

نیز جہاں جہاں بھی ہمارا اثر پہنچا ہے اللہ کے فضل سے دین اور دنیا کا فرق مٹتا چلا گیا ہے اور لوگوں کی سمجھ میں یہ بات اچھی طرح آگئی ہے کہ اپنے تمام معاملات اور انتظام دنیا کو اللہ اور اس کے رسول کے بتائے ہوئے طریقے پر چلانے ہی کا نام دین ہے اور قیام دین کی جدوجہد میں دانستہ کوتاہی کرنے کے بعد زہد وتقدس کے سارے مظاہر سراسر لاحاصل ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کے ہاں قطعاً کوئی وزن نہیں رکھتے۔

ہماری راہ کی رکاوٹیں

ہاں ہمیں اس بات سے انکار نہیں کہ جس تیزی اور خوبی سے یہ کام ہونا چاہیے تھا اور اب تک جو کچھ ہونا چاہیے تھا اس کے لحاظ سے ابھی بہت کمی ہے اور کام کی عام رفتار بھی بہت سست ہے لیکن اس کی ذمہ داری اگر ایک طرف کارکنوں کی اپنی کمزوری اور ناتجربہ کاری پر ہے تو دوسری طرف بہت سے ایسے وجوہ بھی ہیں جن پر ابھی تک اللہ تعالیٰ نے ہمیں اختیار نہیں بخشا۔ اپنی کوتاہیوں کے لیے ہم اللہ تعالیٰ سے معافی چاہتے ہیں اور ان کو دور کرنے کی توفیق اور ہمت طلب کرتے ہیں اور جو ہماری دسترس سے باہر ہیں ان پر اختیار کے لیے دعا اور کوشش کرتے ہیں۔

اس بارے میں ہماری سب سے بڑی مشکل اور رکاوٹ مردان کار اور صحیح قسم کے کارکنوں کی کمی ہے۔ دنیا کی سب تحریکیں اور ان کے بڑے سے بڑے کام کرایہ پر کر ڈالے جاسکتے ہیں مگر اس دعوت کا مزاج ہی کچھ اللہ تعالیٰ نے ایسا رکھا ہے کہ جہاں اس میں کرایہ کے آدمی داخل ہوئے وہیں یہ مرجھا گئی۔ ہمارے ارکان اور بیشتر کارکن تقریباً ہر لحاظ سے ابھی ابتدائی حالت میں ہیں اگرچہ ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو کافی تیزی سے اصلاح قبول کر رہے ہیں لیکن پھر بھی جس عزم، ہمت، قابلیت، اخلاقی پختگی اور ایمانی قوت کی اس کام کو پروان چڑھانے کے لیے ضرورت ہے ان کے پیدا ہونے میں کافی دیر لگے گی۔ انسان بہرحال انسان ہیں، بدلتے بدلتے ہی بدلیں گے۔ ان کو اینٹ پتھر کی طرح ہتھوڑے مار مار کر فوراً مطلوبہ شکل نہیں دی جاسکتی۔ ایک چھوٹے سے چھوٹے پودے کے پروان چڑھنے اور برگ وبار لانے کے لیے بھی اللہ تعالیٰ نے ایک مدت لگی ہے۔ اور پھر انسان تو قوانین طبعی کے سامنے مجبور محض ہونے کے بجائے نفسانی خواہشات اور دوسری بشری کمزوریاں اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی تامل نہیں ہے کہ جو کار عظیم میرے سپرد کیا گیا ہے اس کے لیے جس علم وحکمت، قابلیت، تجربہ اور معاملہ فہمی کی ضرورت ہے اس کا عشر عشیر بھی میں اپنے اندر نہیں پاتا ہوں۔

باپو یا کسی خان بہادر کی نہیں بلکہ ان اکابر امت کی ہیں جن کے زہد و تقویٰ اور دینداری کا ڈھول پوری دنیا میں پٹ رہا ہے اور جن کی آراء گرامی سے محض دینی امور ہی میں نہیں بلکہ دنیاوی اور سیاسی مسائل تک میں اختلاف کرنا ان کے معتقدین کے نزدیک کفر سے کم نہیں۔ عوام میں حق پرستی کی روح پیدا کرنے کے بجائے شخصیت پرستی کا مرض پیدا کر دیا گیا ہے اس لیے ہماری دعوت کے متعلق سب سے پہلا سوال یہی پیدا ہوتا ہے کہ ہے تو یہ حق مگر فلاں حضرت صاحب، فلاں شاہ صاحب اور فلاں مولانا صاحب اس میں کیوں شریک نہیں؟ اور اسی طرح مختلف قسم کے شبہات و شکوک پیدا ہوتے ہیں۔ اگرچہ اس کا بہت بڑا فائدہ یہ ہے کہ جو لوگ دین کو صرف شخصیتوں سے لینے کے قائل ہیں وہ خود بخود چھٹ کر الگ ہو جاتے ہیں اور وہی لوگ ہماری طرف آتے ہیں جو صرف اس عقیدے اور نصب العین سے محبت رکھتے ہیں۔ مگر اس امر سے پیدا شدہ فتنہ بھی کچھ کم اہم نہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان حضرات کو ہدایت دے اور یہ اپنے منصب کو سمجھیں اور ان کو اس بات کا شعور ہو کہ وہ دین حق کی راہ میں دانستہ یا نادانستہ کتنی بڑی رکاوٹ بن گئے ہیں۔

(۵) ہمارے راستے کی پانچویں رکاوٹ ہمارے بعض رفقاء میں یکسوئی کی کمی ہے جس کی اصل وجہ یہ ہے کہ انھوں نے ابھی تک ہماری دعوت اور اس کے طریق کار اور دوسری دعوتوں کو جو ملک میں چل رہی ہیں اور ان کے طریق ہائے کار کے فرق کو اچھی طرح نہیں سمجھا ہے۔ اسی وجہ سے وہ باوجود جماعت میں منسلک ہو جانے کے بار بار دوسرے قافلوں کی طرف دیکھتے ہیں اور ان کے دل کڑھنے لگتے ہیں کہ دوسری تحریکوں کی عمارت کی طرح یہاں بھی رات بھر میں پوری عمارت کیوں نہیں کھڑی ہو جاتی۔ ان حضرات کو اپنی معلومات وسیع تر کرنا چاہیے اور ٹھنڈے دل سے سوچنے اور کام کرنے کی عادت ڈالنی چاہیے۔

تحریک کے اس مرحلے پر ہم صاف طور پر واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ

اولاً ہمارے ساتھ وہی حضرات شریک ہوں، اور جو شریک ہو چکے ہیں ان میں سے صرف وہی حضرات شریک رہیں، جو ہمارے اصول اور طریق کار دونوں سے پوری طرح مطمئن ہوں۔

ثانیاً جو ان دونوں کو اچھی طرح سمجھ کر اور ان کی معرفت حاصل کر کے ان میں پوری پوری دلچسپی لینے کے لیے تیار ہوں اور ثالثاً جن کی دلچسپیوں میں انتشار کے بجائے مرکزیت پیدا ہو چکی ہو، یعنی وہ ہر طرف سے توجہ کو ہٹا کر صرف اسی دعوت پر اپنی تمام توجہات اور دلچسپیاں مرتکز کر دیں اور اپنا سب کچھ اسی کام میں لگا دینے کے لیے تیار ہو جائیں۔

کسی تفصیلی بحث میں الجھے بغیر جماعت اسلامی کے کام کی نوعیت اور مسلمانوں کی دوسری جماعتوں کے پیش نظر کاموں کی نوعیت کا فرق چند فقروں میں واضح کر دوں کہ دوسری ساری جماعتیں مسلمان قوم کا کوئی باقاعدہ علاج کرنے کے بجائے اسے محض فسٹ ایڈ (First Aid) پہنچانے میں مشغول ہیں اور یہی کام ان کے لیے سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے، حالانکہ ان میں سے بعض کے پاس مکمل علاج کا پورا سامان اور بہترین دواخانے بھی موجود ہیں لیکن وہ کچھ اوپری سی مرہم پٹی کر کے اپنی کارگزاری دکھا دینے کے لیے بیتاب ہیں۔ ان کے برعکس ہم مسلمانوں اور پوری دنیا کا مکمل علاج اسی طریق پر کرنا چاہتے ہیں جس طریق پر اس کے ماہرین فن (انبیائے کرام) آج تک دنیا کی اخلاقی اور اجتماعی بیماریوں کا علاج کرتے رہے ہیں۔ کتاب و سنت کی رو سے اس علاج کے سوا دوسرے سارے علاج لغو اور لاحاصل ہیں اور ان کو دی لوگ

جماعت ابھی اس امر کا انتظام کرنے میں بھی کامیاب نہیں ہو سکی کہ اپنی تجویز کے مطابق مرکز میں تربیت گاہ قائم کرکے ارکان اور کارکنوں کی تربیت کا انتظام کرے۔ اس کی بڑی وجہ یہاں پر جگہ (Accomodation) کی قلت ہے۔ اور پھر چونکہ ہماری جماعت کے اٹھانوے فیصدی ارکان غربا اور متوسط طبقہ کے لوگ ہیں اس لیے اگر ان میں سے کسی کا پورا وقت جماعت کے کام کے لیے لیا جائے تو اس کی کم سے کم ضروریات زندگی کا خرچ برداشت کرنا ضروری ہے جس کی جماعت کے بیت المال میں ابھی گنجائش نہیں۔

(۲) ہمارے راستے کی دوسری بڑی رکاوٹ اس عالمگیر جنگ کی پیدا کردہ مشکلات ہیں جن کی حد یہ ہے کہ تشکیل جماعت کے بعد چار سال میں یہ پہلا اجتماع ہے جس میں سارے ملک کے ارکان اور ہمدردان شامل ہو سکے۔ آپ جانتے ہیں کہ اس وقت تک ہماری دعوت و تبلیغ کی اشاعت کا سب سے بڑا بلکہ واحد ذریعہ جماعت کا لٹریچر ہے مگر اس جنگ کی وجہ سے جو کاغذ کا قحط پڑا تو اس کا بھی ایک عرصہ تک کوئی انتظام نہ ہو سکا اور تقریباً پورا ایک سال بیشتر لٹریچر غیر مطبوع (out of print) رہا۔ اب بھی جو کاغذ مل رہا ہے وہ لٹریچر کی مانگ کے لحاظ سے بہت ناکافی ہے اور جنگ کی ابتدا سے اب تک کوئی ایک دن بھی ایسا نہیں آیا کہ ہمارا پورا لٹریچر بیک وقت موجود ہو سکا ہو۔ لٹریچر کی مانگ کی یہ حالت ہے کہ ہر کتاب ایک بار اگر دس ہزار کی تعداد میں طبع کرائی جائے تو شاید چند ماہ کے لیے کفایت کر سکے۔ کتنی کتابیں ایسی ہیں جو ایک مرتبہ بھی شائع نہیں ہو سکیں حالانکہ ملک کے ہر کونے سے ان کے مطالبے آرہے ہیں۔

ہمارے دوسرے بھی بہت سے ضروری کاموں کو یہ جنگ روکے ہوئے ہے جو معمولی حالت میں اتنے بسہولت سرانجام پاگئے ہوتے۔

(۳) ہمارے راستے کی تیسری رکاوٹ ذرائع کی کمی ہے۔ جماعت کی مالی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ اس کا بک ڈپو ہے اور اس وقت تک جماعت کا تقریباً سارا کام اسی کی آمدنی سے چل رہا ہے، سو اس کا حال آپ ابھی سن چکے ہیں۔ اعانت اور زکوٰۃ کی آمدنیاں ابھی کچھ زیادہ نہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ حسب دستور ہمارے ارکان قریباً سب کے سب غریب اور متوسط طبقہ ہی سے نکل کر آئے ہیں اور ان کے لیے اس عالمگیر گرانی کے زمانے میں، خصوصاً جبکہ حتی الامکان حرام و حلال ذرائع کا بھی خیال کرنا ہو، اپنی ضروریات زندگی کا کفیل ہونا ہی مشکل ہو رہا ہے چہ جائیکہ وہ بیت المال کیلئے بھی کچھ پس انداز کر سکیں۔ اگرچہ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ابھی ہمارے بیشتر ارکان میں اپنے نصب العین اور عقیدے کے لیے وہ لگن پیدا نہیں ہوئی جو انھیں اس کے لیے ہر بازی کھیل جانے اور ہر مصیبت سہ جانے کے لیے بیتاب کر دے اور وہ اپنے پیٹ کاٹ کر اپنے دین کی کھیتی کو سینچنے لگیں۔

(۴) ہماری چوتھی مشکل جو دلی تکلیف دینے والی بھی ہے ہمارے طبقہ علما میں سے بعض کا طرز عمل ہے۔ آپ کو یہ معلوم کرکے حیرت ہوگی کہ ہماری تحریک کی کھلی مخالفت بعض علما کے علاوہ اور کسی طرف سے نہیں ہوئی۔ پھر یہ مخالفت بھی کسی عقلی یا نقلی دلیل یا اصولی اختلاف کی بنا پر نہیں بلکہ اس اقرار کے ساتھ ہے کہ نظریہ بالکل صحیح ہے، اسلام کا تقاضا بھی یہی ہے اور دین کا مطالبہ بھی یہی ہے، لیکن یہ آجکل قابل عمل نہیں ہے، تحریک کے "مفید و بارآور" ہونے کے لیے ظروف مساعد نہیں ہیں، اور موجودہ حالات میں یہ جو تم پیش کرتے ہو یعنی دین اسلام، ناممکن العمل ہے۔ یہ امر کسی دیہاتی مسجد کے ملا کسی مغرب زدہ

اختیار کر سکتے ہیں جو یا تو انبیاء کی تعلیمات سے ناواقف ہیں یا پھر خام کاری ہی کرنا چاہتے ہیں۔

ہمارے ارکان کی انفرادی مشکلات

دعوت اسلامی اور قیام دین کی جدوجہد عملاً شروع کر کے معلوم ہوا کہ جس طرح ابتداء سے آج تک دین حق ایک ہی رہا ہے اسی طرح جاہلیت اور کفر کے مزاج میں بھی ذرہ برابر تغیر نہیں ہوا۔ موجودہ سوسائٹی کے تہذیب و تمدن اور رواداری کے فلک شگاف دعاوی کے باوجود باطل کے لیے حق اسی طرح ناقابل برداشت ہے جس طرح پہلے تھا۔ اگر آپ کہیں یہ پاتے ہیں کہ باطل اپنے غلبہ و تسلط کے باوجود حق کی کچھ ظاہری اشکال کو گوارا کر رہا ہے تو سمجھ لیجیے کہ یہ صرف اس لیے ہے کہ حق نے ایک جسد بے روح اور باطل کے ماتحت تابع مہمل بن کر رہنا قبول کر لیا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بیشتر مقامات پر جہاں ہمارے رفقاء نے واقعی سنجیدگی سے اس دعوت کو قبول کیا اور بندگی رب کو مسجد کی چار دیواری سے باہر اپنے معاملات اور دوسرے مسائل زندگی پر پھیلانا شروع کیا تو اسی سوسائٹی اور خاندان و برادری کو جسے کل تک وہ کھانے میں نمک کی طرح مرغوب و محبوب تھے، پھوڑے میں نشتر کی طرح چبھنے لگے۔ اور ان کو وہ سب مل کر بزور اپنے سے باہر نکال پھینکنے کے لیے بیتاب ہو گئے۔ یہ صرف ابھی اتنی سی بات پر ہے کہ ہمارے رفقاء نے اب سوسائٹی کی پسند و ناپسند اور مالی منفعت کی کمی و بیشی کے بجائے اللہ اور اس کے رسول کی پسند و ناپسند کو معیار رد و قبول بنا لیا ہے۔ چنانچہ اسی بناء پر بعض والدین نے اپنے اکلوتے جگر گوشوں کو گھر سے باہر کر دیا اور ان کی شکل دیکھنے کی قسمیں کھا لیں۔ بعض بے دین بیٹوں نے اپنے ضعیف اور سفید ریش باپوں کو مار کر گھر سے نکال دیا کہ وہ ان کی فاسقانہ زندگیوں میں مخل ہوتے تھے۔ بعض بے دین شوہروں نے اپنی بے گناہ بیویوں کو معلق کر کے چھوڑ دیا۔ بعض باطل پرست والدین کے بیٹے جب ان کی خواہش کے مطابق خدمت کفر پر آمادہ نہ ہوئے تو ان کو اس پر مجبور کرنے کے لیے ان کی تعلیم و تربیت پر صرف کیے ہوئے روپے کو قرض قرار دے کر تقاضے شروع کر دیے اور آخر کار شادی کے پھندے میں پھنسا کر بے گھر کر دینے کی چالیں چلیں۔ بعض رئیس زادوں کو انھیں کے حقیقی بھائیوں نے ذلت و رسوائی کی آخری حد تک پہنچانے کی کوششیں کیں اور جائداد سے الگ کر دینے کے منصوبے باندھے۔ اور ہمارے بعض ارکان کو صرف اس بنا پر بڑے بڑے نقصانات پہنچانے کی دھمکیاں دی گئیں اور ڈرایا گیا کہ وہ ان ناخدا ترس لوگوں کے بھائیوں اور بیٹوں کی زندگیوں پر اثر انداز ہو رہے ہیں جس کی وجہ سے وہ حرام اموال اور ناجائز آمدنیوں پر بڑھ بڑھ کر ہاتھ مارنے سے احتراز کرنے لگے ہیں۔

یہ چند ایک مثالیں ہیں جن سے آپ اندازہ فرما سکتے ہیں کہ یہ نام نہاد مسلمان قوم دینی حیثیت سے کس درجہ پر ہے اور ان کی نظروں میں دین کی کیا قدر و منزلت ہے۔

مگر صد ہزار مبارک ترین ہے اللہ کا وہ بندہ جس نے اس عالمگیر ضلالت اور گمراہی کے گھٹاٹوپ اندھیرے میں دنیا کو پھر دین حق سے روشناس کرایا اور اس کے قیام کی دعوت دی اور اس دین کو اس نے ایسے مبین اور واضح طریقے سے دنیا کے سامنے کھول کر رکھ دیا کہ اس سے دور بھاگنے والے بھی یہ اقرار کیے بغیر نہ رہ سکے کہ دین کی نعمت اسی شخص سے پائی۔ اور پھر مبارک ہیں آپ اور آپ جیسے وہ دوسرے حضرات جنھوں نے ان غیر موافق بلکہ شدید مخالف حالات میں اس دعوت کو سنا، قبول کیا

اور اسے عملاً نافذ کرنے کے لیے کمربستہ ہو گئے۔ اپنے اس فضل اور اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ اس توفیق پر آپ جس قدر ناز کریں بجا ہے مگر مومن کا ناز شکریہ اور اللہ کی راہ میں مر مٹنے ہی کی شکل میں ظاہر ہوا کرتا ہے۔ یہ اچھی طرح جان لیجیے کہ دعوت حق کا یہی مرحلہ ہے جس میں اس کے لیے خرچ کیا ہوا ایک پیسہ، اس کے لیے بہایا ہوا خون کا ایک قطرہ اور اس کی خاطر آنکھوں میں کاٹی ہوئی ایک رات، بعد کے مراحل میں کیے ہوئے بڑے بڑے اعمال وایثار سے زیادہ بلندی درجات کا موجب ہو سکتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ صدیق اکبرؓ کی اس ایک رات کے عوض جو انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غار ثور میں بسر کی تھی عمر فاروقؓ جیسا جلیل القدر اور مقدس انسان اپنی پوری زندگی کے اعمال دینے کی عمر بھر حسرت سے خواہش کرتا رہا۔ ہاں: پھر سن لیجیے کہ دعوت کا یہی دور قرب خداوندی اور اس کے ہاں درجات حاصل کرنے کا ہے ورنہ فتح مکہ کے بعد تو سبھی يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا کا منظر پیش کر دیتے ہیں۔

لٹریچر کی دوسری زبانوں میں اشاعت

اس وقت تک اپنی آواز کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے ہم نے صرف اردو زبان ہی کو ذریعہ بنایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان تمام علاقوں میں جہاں اردو بولی اور سمجھی نہیں جاتی ہماری دعوت کا کام بنوز صفر کے ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہی رہی ہے کہ ابتدا سے اب تک اس تحریک اور جماعت کے سارے کام کا بار اور انحصار ہر حیثیت سے امیر جماعت ہی پر رہا ہے اور ظاہر ہے کہ ایک شخص سارے کام نہیں کر سکتا۔ اب دوسری زبانوں میں اس دعوت کو منتقل کرنے کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ اور بہت سی زبانوں میں تو یہ کام عملاً شروع بھی ہو گیا ہے مثلاً

عربی لٹریچر کی تیاری کے لیے مولانا مسعود عالم صاحب ندوی کی قیادت و رہنمائی میں جالندھر میں دار العروبہ کے نام سے عربی ادارہ کی بنیاد رکھ دی گئی ہے اور مولانا اپنی نرزبانی نست اور دوسری مجبوریوں کے باوجود اپنے وطن (صوبہ بہار) سے ہجرت فرما کر مستقل طور پر دار العروبہ میں تشریف لے آئے ہیں اور اپنا پورا وقت، توجہ اور محنت اسی کام پر صرف کر رہے ہیں۔ اس بات کا افسوس ہے کہ دار الاسلام کی آب و ہوا انھیں موافق نہ آئی اور ان کے لیے یہاں سے دور دوسری جگہ انتظام کرنا پڑا دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ مولانا کے اس ایثار و سعی کو قبول فرمائے اور ان کو صحت کامل عطا فرمائے۔ آمین

دار العروبہ سے دعوت کے متعلق دوسرے لٹریچر کے علاوہ ایک پندرہ روزہ یا ماہوار رسالہ بھی جاری کرنے کی تجویز زیر غور ہے۔

ترکی لٹریچر کی تیاری کا کام یہاں دار الاسلام میں ہمارے برادر عزیز اعظم ہاشمی صاحب مہاجر ترکستانی کر رہے ہیں۔ رسالہ دینیات اور خطبات کا ترجمہ اس وقت تک مکمل ہو چکا ہے۔

ملیالم زبان جو صوبہ مدراس کی بڑی زبانوں میں سے ہے اس میں لٹریچر کو منتقل کرنے کا کام حاجی وی۔ پی محمد علی صاحب مالا باری کے سپرد کیا گیا ہے اور یہ صاحب اب تک رسالہ دینیات، خطبات، اور دو تین دوسری چھوٹی بڑی کتابوں کا ترجمہ مکمل کر چکے ہیں۔ ان کی اشاعت کے لیے جنوبی ہند کی جماعتوں نے مل کر کچھ سرمایہ بھی اکٹھا کر لیا ہے اور ان کتابوں کے طبع کرانے کی دوڑ دھوپ بھی جاری ہے لیکن موجودہ جنگی مشکلات کی وجہ سے ابھی تک اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔

تامل زبان میں دعوت کے کام کے لیے جنوبی ہند کی جماعتوں نے مل کر مولوی شیخ عبداللہ صاحب (ولنتا کیم) کو منتخب

گیا ہے کہ وہ اس علاقے میں، رہ کر جہاں کی یہ زبان ہے، مہارت حاصل کریں۔ اس دوران میں شیخ صاحب کی مناسب ضروریات کی کفالت یہ جماعتیں کریں گی۔ یہ کام شروع ہو چکا ہے۔ یہ اقدام بہت مبارک اور قابلِ تقلید ہے اور انتخاب بھی بہت موزوں ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے کامیاب فرمائے۔

گجراتی زبان جو صوبہ بمبئی کی سب سے بڑی زبان ہے اس میں ہمارے لٹریچر کو منتقل کرنے کا ذمہ ہماری بمبئی کی مقامی جماعت نے اپنے ذمہ لیا ہے۔ انھیں اس کارِ خیر کے لیے ایک بہت مخلص گجراتی ادیب جن کا اسم گرامی بھی اسمٰعیل صاحب اخلاص ہے مل گئے ہیں۔ یہ لوگ ابتک چند ایک خطبات گجراتی میں شائع کر چکے ہیں۔ باقی خطبات اور سیاسی کشمکش کا ترجمہ کر رہے ہیں۔ اخلاص صاحب اب جماعت میں شریک ہو گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں استقامت بخشے اور اپنے دین کی خدمت پورے اخلاص سے انجام دینے کی توفیق دے۔

ہندی ترجمہ کا کام الہ باد کی جماعت کے سپرد کیا گیا ہے جو یوپی کی دوسری جماعتوں کی امداد سے یہ کام کرے گی۔ یہ کام ابھی باقاعدہ شروع نہیں ہوا لیکن امید ہے کہ جلدی ہی کچھ انتظام ہو جائے گا۔ موزوں مترجم کا نہ ملنا سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ "سلامتی کا راستہ" کا ترجمہ کروایا جا چکا ہے۔ لیکن یہ ابھی شائع نہیں ہو سکا۔

سندھی زبان میں لٹریچر کو منتقل کرنے کا ابھی کوئی باقاعدہ انتظام تو نہیں ہو سکا البتہ کچھ ایسے لوگ دستیاب ہو گئے ہیں جو کچھ تربیت کے بعد اس کام کو کر سکیں گے۔ ویسے رسالہ دینیات کی نسبت معلوم ہوا ہے کہ ہمارے علم و اطلاع کے بغیر دو تین سال سے سندھی زبان میں شائع ہو رہا ہے لیکن یہ ترجمہ تسلی بخش نہیں ہے۔

انگریزی زبان میں ایک رکن جماعت کچھ تھوڑا تھوڑا ترجمے کا کام کر رہے ہیں۔ اس وقت "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں" کا ترجمہ کیا جا رہا ہے۔ انگریزی ترجمے کے لیے بھی موزوں مترجم کا نہ ملنا ہی بڑی رکاوٹ ہے۔

جماعت کا نیا لٹریچر جو ان دنوں زیرِ طبع ہے۔

جماعت کے لٹریچر کی حسبِ ذیل نئی کتابیں ان دنوں زیرِ طبع ہیں اور ان شاء اللہ بہت جلد چھپ کر آجائیں گی۔

(۱) "قرآن مجید کی چار بنیادی اصطلاحیں"۔ یہ امیر جماعت کے ان مضامین پر مشتمل ہے جو اسلام کی اصطلاحات اربعہ یعنی الٰہ، رب، عبادت، دین کے مطلب اور مفہوم کی توضیح میں رسالہ ترجمان القرآن میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ قرآن کی تعلیمات کو سمجھنے کے لیے یہ کتاب اساسی اہمیت رکھتی ہے۔

(۲) "اسلامی عبادات پر ایک تحقیقی نظر" یہ بھی امیر جماعت کے ایک اہم مضمون پر مشتمل ہے جس کی نوعیت اس کے نام سے ظاہر ہے۔

(۳) "حقیقت توحید" یہ مولانا امین احسن صاحب اصلاحی کی تازہ تصنیف ہے جو "حقیقت شرک" والے سیٹ کی دوسری کڑی ہے۔

(۴) "دعوت اسلامی اور اس کے مطالبات"۔ یہ کتاب حسبِ ذیل چیزوں پر مشتمل ہے:۔

ا۔ "دعوت اسلامی اور اس کا طریق کار" یہ امیر جماعت کی وہ تقریر ہے جو اس رپورٹ کے بعد وہ اس اجلاس میں ارشاد فرمائیں گے۔

ب۔ مولانا امین احسن صاحب کی وہ تقریریں جو انھوں نے سیالکوٹ اور الہ آباد کے اجتماعات میں عام اجلاس میں ارشاد فرمائی تھیں۔ ان دونوں تقریروں کو ایک کر دیا گیا ہے۔

ج۔ قیم جماعت کا وہ پیغام جو ۱۶ جنوری ۱۹۴۵ء کے مطبوعہ "کوثر" میں شائع ہو چکا ہے۔ اس کتاب میں اسے تقریباً سہ گنا کر دیا گیا ہے۔

د۔ مولانا امین احسن صاحب کی وہ تقریر جو انھوں نے الٰہ آباد کے اجتماع میں مستورات کو مخاطب کر کے ارشاد فرمائی۔

صوبوں میں الگ الگ قیموں کا تقرر

چونکہ ایک آدمی کے لیے مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے کہ پورے ملک میں تنظیم کے کام کو سنبھال سکے، خصوصاً جبکہ وہ خود ابتدائی حالت میں ہو، ہاتھ بٹانے کے لیے ایک بھی امدادی آدمی نہ ہو اور ارکان جماعت مسلسل توجہ کے محتاج ہوں۔ اس لیے دور دراز علاقوں کے لیے الگ الگ قیم مقرر کرنے کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ صوبہ بہار کے لیے سید محمد حسنین صاحب جامعی کو قیم مقرر کر دیا گیا ہے اور وہ موجودہ حالات اور وسائل و ذرائع کے لحاظ سے تسلی بخش کام کر رہے ہیں۔ یو۔پی کے لیے بھی الگ قیم جماعت مقرر کرنے کا فیصلہ ہو چکا ہے لیکن ابھی تک موزوں آدمی کا انتخاب نہیں ہو سکا۔ اس اجتماع میں اس فیصلہ کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی جائے گی۔ اسی طرح جنوبی ہند کے لیے بھی الگ قیم جماعت مقرر کرنے کا فیصلہ ہو چکا ہے اور وہاں کے ارکان نے متفقہ طور پر مولانا سید صبغۃ اللہ صاحب بختیاری کو اس کام کے لیے منتخب کیا ہے۔ لیکن ان سب نے مگر اس امر کی طرف بھی مرکز کی توجہ منعطف کرائی ہے کہ یہ کام باقاعدہ ان کے سپرد کرنے سے پہلے ان کو کچھ عرصہ یہاں رہنے کا موقع دیا جائے تاکہ وہ اپنے کام اور فرائض اور ذمہ داریوں کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ سردست وہ اپنی موجودہ مصروفیتوں کی وجہ سے شعبان ۱۳۶۴ھ تک یہاں نہیں آ سکتے اور فی الحال مکانات کی قلت کی وجہ سے ہم بھی اس حال میں نہیں ہیں کہ ان کی رہائش کا یہاں انتظام کر سکیں۔ اس لیے یہ معاملہ چند ماہ کے لیے ابھی ملتوی رہے گا۔

صوبائی قیموں کے فرائض حسب ذیل مقرر کیے گئے ہیں:۔

(۱) اپنے حلقہ کے ارکان اور جماعتوں میں نظم قائم رکھیں اور تحریک کو تازہ رکھنے اور آگے بڑھانے کے لیے ان کو اکساتے رہیں۔

(۲) اپنے حلقہ کے ارکان اور جماعتوں کے ساتھ مسلسل ربط قائم رکھیں، ان کی کارروائیوں سے باخبر رہیں اور مرکز کو اپنے حلقے کے حالات سے باخبر رکھیں۔

(۳) ارکان میں حرکت پیدا کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً اپنے حلقہ میں دورے کرتے رہیں اور جہاں کہیں جماعت کے نظم میں خرابی پیدا ہو رہی ہو وہاں بروقت موقع پر پہنچ کر حالات کی اصلاح کریں۔

صوبائی قیموں کے حلقوں کی جماعتوں اور منفرد ارکان کے فرائض حسب ذیل ہوں گے:۔

(۱) اپنے حلقہ کے قیم کے ساتھ پورا پورا تعاون کرنا اور اپنی کارروائیوں کی ماہوار رپورٹیں قیم حلقہ کو بھیجتے رہنا تاکہ وہ بروقت اپنے حلقہ کی رپورٹ مرکز میں روانہ کر سکے۔

(۲) ان اہم امور کی اطلاع جو مرکز سے متعلق ہوں یا مرکز کے قابل توجہ ہوں، مرکز کو بھیجتے رہنا۔

(۳) جہاں کہیں بدنظمی یا عدم دلچسپی کی کوئی صورت رونما ہوتی نظر آئے اس کی اطلاع فوراً قیم حلقہ اور مرکز کو

بھیجنا تاکہ اس کا بروقت تدارک ہو سکے۔
(۵) حلقہ کی جماعتوں اور ارکان کو اپنے قیم کی مناسب ضروریات کی حد تک اس کے مصارف کا انتظام کرنا ہوگا۔ سفر کے مصارف تو بہر حال ان کو برداشت کرنے ہیں۔
قیم کے انتخاب میں جن اوصاف کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے وہ یہ ہیں:-
(۱) وہ فعال آدمی (Active) ہو۔
(۲) سنجیدہ متین، سمجھدار اور معاملہ فہم ہو۔
(۳) تنظیم کے کام کو سرانجام دینے کی اپنے اندر صلاحیت رکھتا ہو۔
مقام شکر ہے اور میں یہ بیان کرتے ہوئے خوشی محسوس کرتا ہوں کہ شعبۂ تنظیم کے قیام اور اس کی توسیع کے بعد تنظیم کا کام کافی حد تک ضبط میں آگیا ہے۔ اس کے بعد جتنے ارکان جماعت میں لیے گئے ہیں اور جس قدر نئی جماعتوں کی تشکیل کی گئی ہے تقریباً سب پختہ ہیں اور ان کا کام تسلی بخش ہے۔ چند مقامات کے علاوہ ہر جگہ سے ماہواری رپورٹیں باقاعدگی سے آ رہی ہیں۔ مگر اس کے باوجود میں ضروری سمجھتا ہوں کہ دستور جماعت کی دفعات نمبر ۴، ۵، ۶، ۷، اور ۱۰ کی طرف آپ کی توجہ دلاؤں۔ ان دفعات میں جو امور ذکر کیے گئے ہیں وہ اس قدر اہم ہیں کہ سب ارکان کو انھیں وقتاً فوقتاً دیکھتے رہنا چاہیے اور ان کی روشنی میں اپنے ایمان و عمل کا محاسبہ کرنا چاہیے تاکہ ایسا نہ ہو کہ نقض عہد کر کے نہ صرف صاحب امر سے بلکہ خدا اور اس کے رسول کے ساتھ بھی غدر و خیانت کے مرتکب ہوں۔
اس کے علاوہ یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ بعض مقامی جماعتوں کے ارکان مقامی امیر کو صدر انجمن سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ ان کو سمجھ لینا چاہیے کہ جب انھوں نے اپنے میں سے ایک آدمی کو اہل ترسمجھ کر صاحب امر منتخب کیا ہے تو ان پر واجب ہے کہ معروف میں اس کی اطاعت کریں اور اس کی نافرمانی کو گناہ جانیں۔ اس بارے میں کہ ارکان اور صاحب امر کے باہم تعلقات اور حقوق و ذمہ داریاں کیا ہونی چاہئیں امیر جماعت کی وہ تقریر جو انھوں نے تشکیل جماعت کے وقت یہ بار گراں سنبھالتے وقت ارشاد فرمائی تھی بہت ہی اہم ہے۔ اس تقریر کا متعلقہ (Relevant) حصہ روداد جماعت حصہ اول کے صفحہ نمبر ۱ آخری سطر سے صفحہ نمبر 19 وسط صفحہ تک قابل توجہ ہے۔ اس کا گہرا مطالعہ فرما کر آئندہ اپنے تعلقات مذکورہ تقریر کی بیان کردہ بنیادوں پر قائم کیجیے۔

درسگاہ دار الاسلام کا قیام

اگرچہ یہ کام مولانا امین احسن صاحب اصلاحی اور غازی عبد الجبار صاحب کا تھا کہ درسگاہ دار الاسلام کے قیام میں تاخیر کے وجوہ بیان کریں کیونکہ وہی حضرات اس کام کے انچارج ہیں لیکن چونکہ اس تاخیر کی بیشتر ذمہ داری جماعت اور کچھ دوسرے امور پر ہے اس لیے اصلاحی صاحب اور غازی صاحب کے بجائے مجھے ہی اس بارے میں جوابدہی کرنی چاہیے۔
ظاہر ہے کہ درسگاہ کے قیام کے لیے باقاعدہ پختہ عمارت نہ سہی بہر حال وسیع مکانات کی ضرورت ہے اور درسگاہ ہو اور ان کے دار الاقامہ سے بھی پہلے اساتذہ کے کوارٹر موجود ہونے چاہئیں تاکہ وہ یہاں آکر بیٹھیں اور اپنے کام کی تیاری

کریں۔ عمارات جو ہمارے پاس اس وقت موجود ہیں وہ ہمارے موجودہ مقامی کارکنوں کے لیے بھی کافی نہیں۔ مزید تعمیر کے راستے میں جو رکاوٹیں پیش آ رہی ہیں ان میں پھر

(۱) سب سے پہلی اور بڑی رکاوٹ کسی موزوں آدمی کا نہ ملنا ہے جو ہماری تعمیری اسکیم کو اپنے ہاتھ میں لے سکے۔ اس کے لیے ہمیں ایسا آدمی درکار ہے جو تعمیر کے کام کو خوب اچھی طرح سمجھتا ہو، ہم سے اور جماعت سے ہمدردی رکھتا ہو، تجربہ کار، منتظم اور دیانتدار ہو، اور اس کام کو عملاً سرانجام دینے کی قابلیت اور صلاحیت رکھتا ہو تاکہ ہم اس پر اس معاملے میں آنکھیں بند کرکے اعتماد کرسکیں اور وہ اپنی ذمہ داری پر اس کام کو سنبھال سکے۔

(۲) اس کے علاوہ دوسری وجہ مسالہ اور دوسرے سامان تعمیر کی شدید گرانی اور پھر گرانی کے باوجود اس کا نایاب ہونا ہے ہم نے خیال کیا تھا کہ سردست مستقل پختہ عمارتوں کے بجائے کچھ پھونس کے چھپر وغیرہ ڈال کر کام شروع کر دیا جائے مگر حکومت وقت نے اس پر بھی کنٹرول کر لیا۔

(۳) درسگاہ کے قیام کے راستے میں تیسری رکاوٹ سرمایے کی قلت ہے۔ اس بارے میں اول تو ہمارے ذرائع و وسائل ابھی محدود ہیں، دوسرے جیسا کہ پہلے بھی عرض کر چکا ہوں ہمارے ارکان اور ہمدرد جن کے تعاون و اعانت سے ہم اس کام کو سرانجام دینا چاہتے ہیں بیشتر غریب اور متوسط طبقہ کے لوگ ہیں جن کے لیے اس موجودہ گرانی کے زمانے میں اپنی ضروریات زندگی بھی ٹھیک طور سے فراہم کرنا مشکل ہو رہا ہے۔ اور تیسرے ابھی درحاصل ان میں اپنے نصب العین اور مقصد زندگی سے حقیقتاً وہ لگاؤ بھی پیدا نہیں ہوا ہے جو اس کے لیے انھیں ہر قربانی کر جانے پر بے تاب کر دے۔

نیز جن طریقوں اور ذرائع سے عام طور پر دوسرے لوگ اور ادارے سرمایہ فراہم کیا کرتے ہیں ان طریقوں اور ذرائع سے روپیہ فراہم کرنا تو درکنار ہم تو عام پبلک اپیل اور ضرورت کے عام اشتہار کو بھی اپنے مسلک اور طریق کار کے منافی سمجھتے ہیں اور حد یہ ہے کہ اپنے ارکان جماعت تک پر بھی کوئی باضابطہ چندہ عائد کرنا اس کام کو کرنے کی صحیح شکل نہیں سمجھتے۔ ہم دینے والے سے اس کے روپے سے پہلے اس کا دل اس کام کے لیے لینا چاہتے ہیں تاکہ جو کچھ اس کی جیب سے نکلے وہ اس کے دلی جذبہ، دینی لگاؤ اور للہیت کا نتیجہ ہو کہ ایسا ہی سرمایہ فی الحقیقت اس خون صالح کا کام دے سکتا ہے جو ایک صحیح دینی درسگاہ کی رگوں میں جاری ہونا چاہیے اور اسی سے پھر یہ توقع بھی کی جاسکے گی کہ ایسے حق پرست اور خداترس انسان پیدا کرے جو بس ایک رب العٰلمین ہی کے بندے ہوں۔

اس بارے میں ہمارا طریقہ یہ ہے کہ اپنی ضروریات کو اپنے ارکان اور ہمدردوں کے سامنے رکھ دیتے ہیں، اس کے بعد پھر ہر شخص کی اپنی محبت دین، وسعت قلب اور فراخیٔ وسائل پر موقوف ہے کہ وہ صدیق اکبرؓ کی طرح اپنا سوئی سلائی تک کل اثاثہ راہ حق میں لاڈھیر کرے، یا عمر فاروقؓ کی مانند اپنی ہر چھوٹی بڑی چیز کا نصف اپنے رب کی راہ میں نثار کر دے یا چاہے تو قارون کی طرح اپنے خزانوں پر سانپ بن کر بیٹھا رہے۔

لیکن اس سرمایہ کی قلت اور وسائل کی کمی کے باوجود مجھے پورا یقین ہے کہ اگر ہمیں کوئی موزوں آدمی مل جائے اور اپنے

دوسرے کاموں کی طرح اس کام کو بھی ہم اللہ کے بھروسے پر شروع کر دیں تو ان شاء اللہ سرمائے کی وجہ سے یہ کام نہیں رُکے گا۔

اسی فراہمیٔ سرمایہ کے سلسلے میں میں اپنے رفقا اور ہمدردوں کی توجہ اس بات کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ اس وقت ہماری آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ، جیسا کہ میں پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں، ہمارا مکتبہ ہے، اس لیے اس کی سخت ضرورت ہے کہ جو جماعتیں یا افراد یہاں سے کتابیں منگواتے ہیں ان کو اپنے حسابات جلدی سے جلدی بے باق کرتے رہنا چاہیے اور مناسب یہ ہے کہ ہر ماہ نئے آرڈر بھیجنے سے پہلے سابقہ حساب صاف کر دیا جائے تاکہ جماعت کے دوسرے کاموں میں بھی حرج نہ ہو۔

مرکزی بیت المال کے حسابات

چونکہ تشکیل جماعت کے بعد پوری جماعت کا یہ پہلا اجتماع ہے اس لیے ۲۶ اگست ۱۹۴۱ء سے لے کر ۱۶ اپریل ۱۹۴۵ء تک کے حساباتِ آمد و صرف اس اجلاس میں پیش کرتا ہوں تاکہ آپ کو جماعت کی مالی قوت اور اس کے مادی وسائل کی رفتار کا ٹھیک ٹھیک اندازہ ہو جائے۔

۳ شعبان ۱۳۶۰ھ مطابق ۲۶ اگست ۱۹۴۱ء کو جس سرمائے اور وسائل سے قیام دین کی اس جدوجہد کی ابتدا کی گئی تھی اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

نقد	قبضۂ کتب از مکتبہ ترجمان القرآن	واجب الوصول از متفرق تاجرانِ کتب و خریداران بحق مکتبہ ترجمان القرآن
۷۴ - ۱۴ - ۰	۶۰۰۰ - ۰ - ۰ تقریباً	۱۷۲۲ - ۱ - ۶

یہ سرمایہ سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی موجودہ امیر جماعت نے اس کام کی ابتداء کے لیے جماعت کے بیت المال میں منتقل کر دیا۔ بعد کی تفصیلات درج ذیل ہیں:۔

تفصیل آمدنی جماعت اسلامی از یکم ستمبر ۱۹۴۱ء تا ۱۶ اپریل ۱۹۴۵ء

ذریعۂ آمدنی	یکم ستمبر ۱۹۴۱ء تا ۳۱ دسمبر ۱۹۴۲ء	سنہ ۱۹۴۳ء	سنہ ۱۹۴۴ء	از یکم جنوری ۱۹۴۵ء تا ۱۶ اپریل ۱۹۴۵ء	میزان کل مدوار
فروخت کتب	۷۴۱۳ - ۱۵ - ۹	۸۶۳۲ - ۹ - ۹	۱۶۷۹۹ - ۰ - ۹	۹۷۲۷ - ۱۵ - ۳	۴۲۵۷۳ - ۹ - ۶
امانت اہل خیر	۵۹۴۳ - ۱۲ - ۹	۲۸۴۵ - ۳ - ۶	۸۱۵۹ - ۳ - ۶	۲۵۸۳ - ۱۱ - ۰	۱۹۵۳۱ - ۱۵ - ۹
زکوٰۃ	۶۱۶ - ۱۰ - ۳	۱۲۰۳ - ۵ - ۰	۲۳۲۰ - ۱۱ - ۸	۹۷۷ - ۱۰ - ۰	۵۱۱۸ - ۴ - ۱۱
قرض	۲۱۴۱ - ۰ - ۰	۰ - ۰ - ۰	۲۰۰۰ - ۰ - ۰	۰ - ۰ - ۰	۴۱۴۱ - ۰ - ۰
وصولی قرض	۱۵۰ - ۲ - ۶	۲۰۲ - ۰ - ۰	۴۲۷ - ۰ - ۰	۱۳۰ - ۰ - ۰	۹۰۹ - ۲ - ۶
متفرق	۶۶۴ - ۱۲ - ۳	۰ - ۹ - ۳	۱۱۳ - ۳ - ۷	۵۶ - ۷ - ۶	۸۳۵ - ۱ - ۷
امانت	۰ - ۰ - ۰	۱۰ - ۸ - ۰	۰ - ۰ - ۰	۰ - ۰ - ۰	۱۰ - ۸ - ۰
میزان کل سالوار	۱۶۹۳۰ - ۷ - ۶	۱۲۸۹۴ - ۳ - ۶	۲۹۸۱۹ - ۳ - ۶	۱۳۴۷۵ - ۱۱ - ۹	۷۳۱۱۹ - ۱۰ - ۳
نقد سرمایہ بوقت تشکیل جماعت					۷۴ - ۱۴ - ۰
کل آمدنی از تشکیل جماعت تا ۱۶ اپریل ۱۹۴۵ء =					۷۳۱۹۴ - ۸ - ۳

تفصیل مصارف جماعت اسلامی از یکم ستمبر ۱۹۴۱ء تا ۱۶ اپریل ۱۹۴۵ء

قسم مصارف	از یکم ستمبر ۱۹۴۱ء تا ۳۱ دسمبر ۱۹۴۲ء	۱۹۴۳ء	۱۹۴۴ء	از یکم جنوری ۱۹۴۵ء تا ۱۶ اپریل ۱۹۴۵ء	میزان کل مدوار
معاوضہ کارکنان	۶۷۴-۰-۰	۱۰۵۴-۱۲-۰	۳۳۷۰-۹-۶	۱۵۰۰-۱۲-۰	۶۶۰۰-۴-۶
طباعت	۵۳۶۵-۱۵-۳	۷۳۰-۹-۹	۱۷۴۴۲-۱۵-۶	۵۰۷۰-۱-۰	۲۸۶۰۹-۹-۶
سٹیشنری	۹۸-۴-۶	۳۹-۱۵-۰	۱۷۹-۱-۹	۱۳۷-۱۲-۰	۴۵۵-۱-۳
اشتہار	۲۵-۸-۰	۰-۰-۰	۰-۰-۰	۰-۰-۰	۲۵-۸-۰
سفر خرچ	۲۸۶-۲-۰	۲۳-۹-۰	۷۸۶-۱-۶	۰-۰-۰	۱۳۰۲-۱۲-۶
مہمان خانہ	۴۶۵-۱۳-۶	۸-۱۵-۳	۱۲۵۴-۱۵-۰	۵۷۹-۳-۹	۲۳۰۸-۱۵-۶
پریس	۳۱۳۷-۱-۳	۰-۰-۰	۱۸۷-۱۰-۰	۰-۰-۰	۳۳۲۴-۱۱-۳
قرض	۲۵۹-۲-۶	۳۴۰-۰-۰	۹۷۳-۱۲-۰	۳۵۰-۰-۰	۱۹۲۲-۱۴-۶
ادائے قرض	۱۴۴۳-۰-۰	۱۶۰-۰-۰	۱۲۰۶-۱۰-۹	۲۰۰۰-۰-۰	۴۸۰۹-۱۰-۹
دارالعروبہ	۲۰-۰-۰	۰-۰-۰	۰-۰-۰	۳۲۶-۰-۰	۳۴۶-۰-۰
اعانت	۱۵۰-۴-۰	۴۲۴-۲-۳	۸۶۳-۲-۹	۱۳۶-۸-۶	۱۵۷۴-۱-۶
ڈاک خرچ	۵۸۹-۱۰-۶	۵۴۸-۱۳-۰	۷۶۲-۷-۹	۲۴۹-۳-۹	۲۱۵۰-۳-۰
کتب ایجنسی	۱۱۹۵-۰-۰	۱۳۶۴-۱۵-۰	۷۳۷۳-۳-۰	۲۵۷۲-۱۳-۰	۱۲۵۰۵-۱۵-۰
متفرق	۲۵۳-۱۳-۶	۷۲۰-۳-۳	۳۳۷-۳-۳	۵۰-۴-۳	۱۳۶۱-۸-۳
تعلیمی اسکیم	۰-۰-۰	۱۷-۰-۰	۱۶-۸-۰	۴-۱۳-۰	۳۸-۵-۰
فرنیچر	۰-۰-۰	۳۳-۱-۰	۱۰۸-۴-۹	۱۵-۴-۰	۱۵۶-۹-۹
کتب خانہ	۰-۰-۰	۰-۰-۰	۵-۰-۰	۲۴۳-۱-۶	۲۴۸-۱-۶
ترکی ترجمہ	۰-۰-۰	۰-۰-۰	۸۰-۰-۰	۵۰-۰-۰	۱۳۰-۰-۰
تعمیرات	۰-۰-۰	۰-۰-۰	۰-۰-۰	۴۴۲-۸-۶	۴۴۲-۸-۶
میزان کل سالوار	۱۳۹۶۳-۱۱-۰	۵۷۶۳-۰-۶	۳۳۹۴۷-۹-۶	۱۳۷۲۸-۷-۳	۶۸۳۱۲-۱۲-۳

میزان کل آمدنی از یکم ستمبر ۱۹۴۱ء تا ۱۶ اپریل ۱۹۴۵ء = ۷۳۱۹۴-۸-۳

میزان کل صرف از " " " " = ۶۸۳۱۲-۱۲-۳

بقایا جو نقد موجود ہے = ۴۸۸۱-۱۲-۰

اس کے علاوہ مکتبہ جماعت میں اس وقت تقریباً پچیس، ہزار روپے کی کتابیں موجود ہیں۔ یہ اعداد و شمار ہیں جن سے ٹھیک ٹھیک اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس ملک کے لوگ ہم سے کس قدر اور کس رفتار سے متاثر ہو رہے ہیں کیونکہ اس عام مادہ پرستی کے زمانے میں ہمارے روکھے پھیکے اور دنیا کے چلتے ہوئے مذاق کے بالکل برعکس لٹریچر کی خریداری کے لیے اور ہمارے بے مزہ کام کی اعانت کے لیے وہی لوگ آتے ہیں جو فی الواقع اس سے دلچسپی اور لگاؤ رکھتے ہیں۔

قیم جماعت کی رپورٹ کے بعد امیر جماعت نے "دعوتِ اسلامی اور اس کا طریق کار" کے عنوان سے ایک نہایت ہی اہم تقریر فرمائی جس میں اپنی اس دعوت اور اس کے طریق کار پر بہت تفصیل سے اور نہایت مبین طریقے سے روشنی ڈالی اور بتایا کہ کیوں اس ایک راہ اور طریق کار کے سوا دوسری ساری راہیں مسلمانوں کے لیے غلط اور اسلامی نقطۂ نظر سے ناقابلِ قبول ہیں اور وہ اس پر کوتاہی برت کر کس طرح مبادیاتِ دین تک سے دور ہو گئے ہیں۔ اس تقریر میں بہت سے ان اعتراضات اور شکوک کو بھی صاف کیا جو عام طور پر ہمارے بارے میں لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ یہ تقریر پہلے ہی نوٹ کرا دی گئی تھی اس لیے لفظ بلفظ درج ذیل ہے۔

دعوتِ اسلامی اور اس کا طریق کار

حمد و ثنا کے بعد فرمایا:۔

سب سے پہلے میں اس امر پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے ہمیں ایک نہایت خشک دعوت اور نہایت بے مزہ طریق کار کو بالآخر لوگوں کے لیے دلچسپ و خوش ذائقہ بنانے میں توقع سے زیادہ کامیابی عطا کی۔ ہم جس دعوت کو لے کر اٹھے تھے اس سے زیادہ کاسد جنس آج دنیا کی دعوتوں کے بازار میں اور کوئی نہ تھی اور اس کے لیے جو طریق کار ہم نے اختیار کیا اس کے اندر ان چیزوں میں سے کوئی چیز بھی نہ تھی جو آج کل دنیا کی دعوتوں کے پھیلانے میں اور خلق کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں استعمال کی جاتی ہیں۔ نہ جلسے نہ جلوس، نہ نعرے نہ جھنڈے، نہ مظاہرے نہ نمائش نہ تقریریں نہ وعظ۔ لیکن اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں اور یہ دیکھ کر ہمارا دل شکر و سپاس کے جذبے سے لبریز ہو جاتا ہے کہ بندگانِ خدا روز بروز زیادہ کثرت کے ساتھ ہماری اس دعوت کی طرف کھنچ رہے ہیں اور ہمارے بے لطف اجتماعات میں شرکت کے لیے دور دور سے بغیر کسی طلب کے آتے ہیں۔

ہمارے اس اجتماع کا اعلان صرف ایک مرتبہ اخبار کوثر میں شائع ہوا اور اس کے بعد کوئی پروپیگنڈا اور کسی قسم کی اشتہار بازی عام اصطلاح میں "جلسہ کو کامیاب بنانے کے لیے" نہیں کی گئی، پھر بھی ایک ہزار اشخاص ہندوستان کے مختلف گوشوں سے یہاں آ کر جمع ہو گئے۔ یہ کشش بہرحال حق ہی کی کشش ہے کیونکہ ہمارے پاس حق کے سوا کوئی اور چیز کھینچنے والی سرے سے ہے ہی نہیں۔

اجتماعات کا مقصد ہمارے ان اجتماعات کا مقصد کوئی مظاہرہ کرنا اور ہنگامہ برپا کر کے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنا نہیں ہے۔ ہماری غرض ان سے صرف یہ ہے کہ ہمارے ارکان ایک دوسرے سے متعارف اور مربوط ہوں، ان کے درمیان اجنبیت اور ناآشنائی باقی نہ رہے، وہ ایک دوسرے سے قریب ہوں اور باہمی مشورے سے تعاون کی صورتیں نکالیں اور اپنے کام کو آگے بڑھانے اور مشکلاتِ راہ اور پیش آمدہ مسائل کو حل کرنے کی تدبیریں سوچیں۔ اس کے علاوہ ہمارے پیش نظر ان اجتماعات سے یہ فائدہ بھی ہے کہ ہمیں اپنے کام کا جائزہ لینے اور اس کی کمزوریوں کو سمجھنے اور انہیں دور کرنے کا وقتاً فوقتاً موقع ملتا رہتا ہے۔ نیز جو لوگ ہم سے ہمدردی رکھتے ہیں یا ہمارے خیالات سے متاثر ہیں یا ہمارے کام کے متعلق کچھ شکوک و شبہات رکھتے ہیں ان کو بھی یہ موقع مل جاتا ہے کہ بالمشافہ ہماری دعوت اور ہمارے کام کو سمجھیں اور اگر ان کا دل گواہی دے کہ ہم واقعی حق پر ہیں تو ہمارے ساتھ شریک ہو جائیں۔ بہت سی غلط فہمیاں ایسی ہوتی ہیں کہ وہ صرف دوری کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں اور بڑھتی رہتی ہیں، محض قرب اور مشاہدہ و معائنہ اور شخصی تعلق (Personal Contact) ہی ایسی غلط فہمیوں کو رفع کر دینے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ ہم خدا کا شکر ادا کرتے ہیں اور ان حضرات کے بھی شکر گزار ہیں جو اپنا وقت اور اپنا مال صرف کر کے ہمارے ان اجتماعات میں محض ہماری بات کو سمجھنے کے لیے تشریف لاتے ہیں۔ ہم ان کی اس جستجوئے حق کو نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ جہاں ان کی دلچسپی کا کوئی سامان نہیں ہے وہاں وہ محض اس وجہ سے آتے ہیں کہ اللہ کے کچھ بندے جو اللہ کا نام لے کر ایک کام کر رہے ہیں ان کے متعلق تحقیق کریں

کہ واقعی ان کا کام کس حد تک اللہ کا ہے اور اللہ کے لیے ہے۔ یہ مخلصانہ حق جوئی اگر ذہن و دماغ کی صفائی کے ساتھ بھی ہو تو اللہ ان کی سعی و جستجو کو ضائع ہونے دے گا اور ضرور انھیں حق کے نشانات راہ دکھا دے گا۔

چونکہ یہاں ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ہماری دعوت اور ہمارا مقصد کیا ہے اور کس طریقے سے ہم اس کو حاصل کرنا چاہتے ہیں اس لیے سب سے پہلے میں انہی دو امور پر کچھ عرض کروں گا۔

ہماری دعوت کیا ہے

ہماری دعوت کے متعلق عام طور پر جو بات کہی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ ہم حکومت الٰہیہ کے قیام کی دعوت دیتے ہیں حکومت الٰہیہ کا لفظ کچھ تو خود غلط فہمی پیدا کرتا ہے اور کچھ اسے غلط فہمی پیدا کرنے کا ذریعہ بنایا جاتا ہے۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں اور انھیں ایسا سمجھایا بھی جاتا ہے کہ حکومت الٰہیہ سے مراد محض ایک سیاسی نظام ہے اور ہماری غرض اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ موجودہ نظام کی جگہ وہ مخصوص سیاسی نظام قائم ہو۔ پھر چونکہ اس سیاسی نظام کے چلانے والے لامحالہ وہی مسلمان ہوں گے جو اس کے قیام کی تحریک میں حصہ لے رہے ہوں اس لیے خود بخود اس تصور میں سے یہ معنی نکل آتے ہیں یا ہوشیاری کے ساتھ نکال لیے جاتے ہیں کہ ہم محض حکومت چاہتے ہیں۔ اس کے بعد ایک دیندارانہ وعظ شروع ہوتا ہے اور ہم سے کہا جاتا ہے کہ تمہارے پیش نظر محض دنیا ہے حالانکہ مسلمان کے پیش نظر دین اور آخرت ہونی چاہیے۔ اور یہ کہ حکومت طلب کرنے کی چیز نہیں ہے بلکہ ایک انعام ہے جو دیندارانہ زندگی کے صلے میں اللہ کی طرف سے مل جاتا ہے۔ یہ باتیں کہیں تو نافہمی کے ساتھ کی جاتی ہیں اور کہیں نہایت ہوشمندی کے ساتھ اس غرض کے لیے کہ اگر ہمیں نہیں تو کم سے کم خلق خدا کے بڑے حصے کو بدگمانیوں اور غلط فہمیوں میں مبتلا کیا جائے حالانکہ اگر کوئی شخص ہمارے لٹریچر کو کھلے دل کے ساتھ پڑھے تو اس پر بآسانی یہ بات کھل سکتی ہے کہ ہمارے پیش نظر صرف ایک سیاسی نظام کا قیام نہیں ہے بلکہ ہم چاہتے ہیں کہ پوری انسانی زندگی ——— انفرادی و اجتماعی ——— میں وہ ہمہ گیر انقلاب رونما ہو جو اسلام رونما کرنا چاہتا ہے جس کے لیے اللہ نے اپنے انبیاء کو مبعوث کیا تھا اور جس کی دعوت دینے اور جد و جہد کرنے کے لیے ہمیشہ انبیاء علیہم السلام کی امامت و رہنمائی میں امت مسلمہ کے نام سے ایک گروہ بنتا رہا ہے۔

دعوت اسلامی کے تین نکات

اگر ہم اپنی اس دعوت کو مختصر طور پر صاف اور سیدھے الفاظ میں بیان کرنا چاہیں تو یہ تین نکات (Points) پر مشتمل ہوگی:

(۱) یہ کہ ہم بندگان خدا کو بالعموم اور جو پہلے سے مسلمان ہیں ان کو بالخصوص اللہ کی بندگی کی دعوت دیتے ہیں۔

(۲) یہ کہ جو شخص بھی اسلام قبول کرنے یا اس کو ماننے کا دعویٰ یا اظہار کرے اس کو ہم دعوت دیتے ہیں کہ وہ اپنی زندگی سے منافقت اور تناقض کو خارج کرے اور جب وہ مسلمان ہے یا بنا ہے تو مخلص مسلمان بنے اور اسلام کے رنگ میں رنگ کر یکرنگ ہو جائے۔

(۳) یہ کہ زندگی کا نظام جو آج باطل پرستوں اور فساق و فجار کی رہنمائی اور قیادت و فرمانروائی میں چل رہا ہے اور معاملات دنیا کے انتظام کی زمام کار جو خدا کے باغیوں کے ہاتھ میں آگئی ہے، ہم یہ دعوت دیتے ہیں کہ اسے بدلا جائے اور رہنمائی و امامت نظری اور عملی دونوں حیثیتوں سے مومنین صالحین کے ہاتھ میں منتقل ہو۔

یہ تینوں نکات اگرچہ اپنی جگہ بالکل صاف ہیں لیکن ایک مدت دراز سے ان پر غفلتوں اور غلط فہمیوں کے پردے پڑے رہے ہیں اس لیے بدقسمتی سے آج غیر مسلموں کے سامنے ہی نہیں بلکہ مسلمانوں کے سامنے بھی ان کی تشریح کرنے کی ضرورت پیش آگئی ہے۔

بندگی رب کا حقیقی مفہوم

اللہ کی بندگی کی طرف دعوت دینے کا مطلب صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ خدا کو خدا اور اپنے آپ کو خدا کا بندہ تسلیم کیا

مگر اس کے بعد اخلاقی و عملی اور اجتماعی زندگی ویسی کی ویسی ہی رہے جیسی خدا کو نہ ماننے اور اس کی بندگی کا اعتراف نہ کرنے کی صورت میں ہوتی ہے۔ اسی طرح خدا کی بندگی کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ خدا کو فوق الفطری طریقے پر خالق اور رازق اور معبود تسلیم کر لیا جائے مگر عملی زندگی کی فرمانروائی و حکمرانی سے اس کو بے دخل کر دیا جائے۔ اسی طرح خدا کی بندگی کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ زندگی کو مذہبی اور دنیوی دو الگ الگ حصوں میں تقسیم کیا جائے اور صرف مذہبی زندگی میں جس کا تعلق عقائد اور عبادات اور حرام و حلال کی چند محدود قیود سے سمجھا جاتا ہے خدا کی بندگی کی جائے، باقی رہے دنیوی معاملات جو تمدن، معاشرت، سیاست، معیشت، علوم و فنون اور ادب وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں تو ان میں انسان خدا کی بندگی سے بالکل آزاد رہے اور جس نظام کو چاہے خود وضع کرے یا دوسروں کے وضع کیے ہوئے کو اختیار کرے۔ بندگیِ رب کے ان سب مفہومات کو ہم سراسر غلط سمجھتے ہیں، ان کو مٹانا چاہتے ہیں اور ہماری لڑائی جتنی شدت کے ساتھ نظامِ کفر کے ساتھ ہے اتنی ہی بلکہ اس سے زیادہ شدت کے ساتھ بندگی کے ان مفہومات کے خلاف ہے، کیونکہ ان کی بدولت دین کا تصور ہی سرے سے مسخ ہو گیا ہے۔ ہمارے نزدیک قرآن اور اس سے پہلے کی تمام آسمانی کتابیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ سے پہلے کے تمام پیغمبر جو دنیا کے مختلف گوشوں میں آئے ان کی بالاتفاق دعوت جس بندگیِ رب کی طرف تھی وہ یہ تھی کہ انسان خدا کو پورے معنی میں الٰہ اور رب، معبود اور حاکم، آقا اور مالک، رہنما اور قانون ساز، محاسب اور مجازی (جزا دینے والا) تسلیم کرے اور اپنی پوری زندگی کو خواہ وہ شخصی (Individual) ہو یا اجتماعی، اخلاقی ہو یا مذہبی، تمدنی و سیاسی اور معاشی ہو یا علمی و نظری، اسی ایک خدا کی بندگی میں سپرد کر دے۔ یہی مطالبہ ہے جو قرآن میں اس طرح کیا گیا ہے کہ ادخلوا فی السلم کافۃ: تم پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ یعنی اپنی زندگی کے کسی پہلو اور کسی شعبے کو بندگیِ رب سے محفوظ (Reserve) کر کے نہ رکھو۔ اپنے تمام وجود کے ساتھ، اپنی پوری ہستی کے ساتھ خدا کی غلامی و اطاعت میں آجاؤ۔ زندگی کے کسی معاملے میں بھی تمہارا یہ طرزِ عمل نہ ہو کہ اپنے آپ کو خدا کی بندگی سے آزاد سمجھو اور اس کی رہنمائی و ہدایت سے مستغنی ہو کر اور اس کے مقابلہ میں خود مختار بن کر یا کسی خود مختار بنے ہوئے بندے کے پیرو یا مطیع ہو کر وہ راہ چلنے لگو جس کی ہدایت خود خدا نے نہ دی ہو۔ بندگی کا یہی وہ مفہوم ہے جس کی ہم تبلیغ کرتے ہیں اور جسے قبول کرنے کی سب لوگوں کو، مسلمانوں اور غیر مسلموں سب کو، دعوت دیتے ہیں۔

منافقت کی حقیقت دوسری چیز جس کی ہم دعوت دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ اسلام کی .... پیروی کا دعویٰ کرنے والے یا اسلام قبول کرنے والے سب لوگ منافقانہ رویے کو بھی چھوڑیں اور اپنی زندگی کو تناقضات سے بھی پاک کریں۔ منافقانہ رویے سے ہماری مراد یہ ہے کہ آدمی جس دین کی پیروی کا دعویٰ کرے اس کے بالکل برخلاف نظامِ زندگی کو اپنے اوپر حاوی و مسلط پا کر راضی اور مطمئن رہے۔ اس کو بدل کر اپنے دین کو اس کی جگہ قائم کرنے کی کوئی سعی نہ کرے بلکہ اس کے برعکس اسی فاسقانہ و باغیانہ نظامِ زندگی کو اپنے لیے سازگار بنانے اور اس میں اپنے لیے آرام کی جگہ پیدا کرنے کی فکر کرتا رہے، یا اگر اس کو بدلنے کی کوشش بھی کرے تو اس کی غرض یہ نہ ہو کہ اس فاسقانہ نظامِ زندگی کی جگہ دینِ حق قائم ہو، بلکہ صرف یہ کوشش کرے کہ ایک فاسقانہ نظام ہٹ کر دوسرا فاسقانہ نظام اس کی جگہ قائم ہو جائے۔ ہمارے نزدیک یہ طرزِ عمل سراسر منافقانہ ہے، اس لیے کہ ہمارا ایک نظامِ زندگی پر ایمان رکھنا اور دوسرے نظامِ زندگی میں راضی رہنا بالکل ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ مخلصانہ ایمان کا اولین تقاضا یہ ہے کہ جس طریقِ زندگی پر ہم ایمان رکھتے ہیں اسی کو ہم اپنا قانونِ حیات دیکھنا چاہیں اور ہماری روح اپنی آخری گہرائیوں تک ہر اس رکاوٹ کے پیش آجانے پر بے چین و مضطرب ہو جائے جو اس طریقِ زندگی کے مطابق جینے میں سدِ راہ بن رہی ہو۔ ایمان تو ایسی کسی چھوٹی سے چھوٹی رکاوٹ کو بھی برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتا، کجا کہ اس کا پورا کا پورا دین کسی دوسرے

نظامِ زندگی کا تابع مہمل بن کر رہ گیا ہو۔ اس دین کے کچھ اجزاء پر عمل درآمد ہوتا بھی ہو تو صرف اس وجہ سے کہ غالب نظامِ زندگی نے ان کو بے ضرر سمجھ کر رعایتہً باقی رکھا ہو اور ان رعایات (Concessions) کے ماسوا ساری زندگی کے معاملات دین کی بنیادوں سے ہٹ کر غالب نظامِ زندگی کی بنیادوں پر چل رہے ہوں اور پھر بھی ایمان اپنی جگہ نہ صرف خوش اور مطمئن ہو بلکہ جو کچھ بھی سوچے اسی غلبۂ کفر کو اصول موضوعہ کے طور پر تسلیم کر کے سوچے۔ اس قسم کا ایمان ہے فقہی اعتبار سے معتبر ہو لیکن دینی لحاظ سے تو اس میں اور نفاق میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اور قرآن کی متعدد آیات اس بات پر شاہد ہیں کہ حقیقت میں نفاق یہی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ جو لوگ بھی اپنے آپ کو بندگیٔ رب کے اس مفہوم کے مطابق جس کی ابھی میں نے تشریح کی ہے خدائے واحد کی بندگی میں دینے کا اقرار کریں ان کی زندگی اس نفاق سے پاک ہو۔ بندگی ہی کے اس مفہوم کا تقاضا یہ ہے کہ ہم سچے دل سے یہ چاہیں کہ جو طریقِ زندگی، جو قانونِ حیات، جو اصولِ تمدن و اخلاق و معاشرت و سیاست، جو نظامِ فکر و عمل اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کے واسطے سے ہمیں دیا ہے، ہماری زندگی کا پورا کاروبار اسی کی پیروی میں چلے اور ہم ایک لمحے کے لیے بھی اپنی زندگی کے کسی چھوٹے سے چھوٹے شعبے کے اندر بھی اس نظامِ حق کے خلاف کسی دوسرے نظام کے تسلط کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہ ہوں۔ اب آپ خود سمجھ لیں کہ نظامِ باطل کے تسلط کو برداشت کرنا بھی جبکہ تقاضائے ایمان کے خلاف ہو تو اس پر راضی و مطمئن رہنا اور اس کے قیام و بقا کی سعی میں حصہ لینا یا ایک نظامِ باطل کی بجائے دوسرے نظامِ باطل کو سرفراز کرنے کی کوشش کرنا ایمان کے ساتھ کیسے میل کھا سکتا ہے۔

تناقض کی حقیقت

اس نفاق کے بعد دوسری چیز جس کو ہم ہر پیمانے اور ہر مسلمان کی زندگی سے خارج کرنا چاہتے ہیں اور جس کے خارج کرنے کی ہر مدعی ایمان کو دعوت دیتے ہیں وہ تناقض ہے۔ تناقض سے ہماری مراد یہ ہے کہ آدمی جس چیز کا زبان سے دعویٰ کرے عمل سے اس کی خلاف ورزی کرے۔ نیز یہ بھی تناقض ہے کہ آدمی کا اپنا عمل ایک معاملے میں کچھ ہو اور دوسرے معاملے میں کچھ اور۔ اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس نے اپنی پوری زندگی کو خدا کی بندگی میں دے دیا ہے تو اسے جان بوجھ کر کوئی حرکت بھی ایسی نہ کرنی چاہیے جو بندگیٔ رب کی ضد ہو، اور اگر بشری کمزوری کی بنا پر ایسی کوئی حرکت اس سے سرزد ہو جائے تو اسے اپنی غلطی کا اعتراف کر کے پھر بندگیٔ رب کی طرف پلٹنا چاہیے۔ ایمان کے مقتضیات میں سے یہ بھی ایک اہم مقتضا ہے کہ پوری زندگی صبغۃ اللہ میں رنگی ہوئی ہو۔ یک رنگی اور پوری زندگی تو درکنار دو رنگی زندگی بھی دعوئے ایمان کے ساتھ میل نہیں کھاتی۔ ہمارے نزدیک یہ بات بہروپیے پن سے کچھ کم نہیں ہے کہ ہم ایک طرف تو خدا اور آخرت اور وحی اور نبوت اور شریعت کو ماننے کا دعویٰ کریں اور دوسری طرف دنیا کی طلب میں لپکے ہوئے ان درسگاہوں کی طرف خود دوڑیں۔ انسان کو کو ان کا شوق دلائیں اور خود اپنے اہتمام میں ایسی درسگاہیں چلائیں جن میں انسان کو خدا سے دور کرنے والی، آخرت کو بھلا دینے والی مادہ پرستی میں غرق کر دینے والی تعلیم دی جاتی ہو۔ ایک طرف ہم خدا کی شریعت پر ایمان رکھنے کا دعویٰ کریں اور دوسری طرف ان عدالتوں کے وکیل اور جج بنیں اور انہی عدالتوں کے فیصلوں پر حق اور غیر حق کے فیصلے کا دارومدار رکھیں جو شریعتِ الٰہی کو دیوانِ عدالت سے بے دخل کر کے شریعتِ غیر الٰہی کی بنیاد پر قائم کی گئی ہوں۔ ایک طرف ہم مسجد میں جا جا کر نمازیں پڑھیں اور دوسری طرف مسجد سے باہر نکلتے ہی اپنے گھر کی زندگی میں اپنے لین دین میں، اپنی معاش کی فراہمی میں، اپنی شادی بیاہ میں، اپنی میراثوں کی تقسیم میں، اپنی سیاسی تحریکوں میں، اور اپنے سارے دنیوی معاملات میں خدا اور اس کی شریعت کو بھول کر کہیں اپنے نفس کے قانون کی، کہیں اپنی برادری کے رواج کی، کہیں اپنی سوسائٹی کے طور طریقوں کی اور کہیں خدا سے پھرے ہوئے حکمرانوں کے قوانین کی پیروی میں کام کرنے لگیں۔ ایک طرف ہم اپنے خدا کو بار بار یقین دلائیں کہ ہم تیرے ہی بندے

ہیں اور تیری ہی عبادت کرتے ہیں، اور دوسری طرف ہر اس بت کی پوجا کریں جس کے ساتھ ہمارے مفاد، ہماری دلچسپیاں اور ہماری محبتیں اور آسائشیں کچھ بھی وابستگی رکھتی ہوں۔ یہ اور ایسے بے شمار تناقضات جو آج مسلمانوں کی زندگی میں پائے جاتے ہیں، جن کے موجود ہونے سے کوئی ایسا شخص جو بینائی رکھتا ہو انکار نہیں کر سکتا، ہمارے نزدیک وہ اصلی گھن ہیں جو امت مسلمہ کی سیرۃ و اخلاق کو اور اس کے دین و ایمان کو اندر ہی اندر کھائے جاتے ہیں اور آج زندگی کے ہر پہلو میں مسلمانوں سے جن کمزوریوں کا اظہار ہو رہا ہے ان کی اصل جڑ یہی تناقضات ہیں۔ ایک مدت تک مسلمانوں کو یہ اطمینان دلایا جاتا رہا ہے کہ تم شہادت توحید و رسالت زبان سے ادا کرنے اور روزہ و نماز وغیرہ چند مذہبی اعمال کر لینے کے بعد خواہ کتنے ہی غیر دینی اور غیر ایمانی طرز عمل اختیار کر جاؤ بہرحال نہ تمہارے اسلام پر کوئی آنچ آ سکتی ہے اور نہ تمہاری نجات کو کوئی خطرہ لاحق ہو سکتا ہے حتیٰ کہ اس ڈھیل (Allowance) کی حدود اس حد تک بڑھیں کہ نماز روزہ بھی مسلمان ہونے کے لیے شرط نہ رہا اور مسلمانوں میں عام طور پر یہ تخیل پیدا کر دیا گیا کہ اگر ایک طرف ایمان و اسلام کا اقرار ہو اور دوسری طرف ساری زندگی اس کی ضد ہو تب بھی کچھ نہیں بگڑتا ﴿لَن تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُودَةً﴾۔ اسی چیز کا نتیجہ آج ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ اسلام کے نام کے ساتھ ہر فسق، ہر کفر، ہر معصیت و نافرمانی اور ہر ظلم و سرکشی کا جوڑ آسانی سے لگ جاتا ہے اور مسلمان مشکل ہی سے یہ محسوس کرتے ہیں کہ جن راہوں میں وہ اپنے اوقات، اپنی محنتیں، اپنے مال، اپنی قوتیں اور قابلیتیں اور اپنی جانیں کھپا رہے ہیں اور جن مقاصد کے پیچھے ان کی انفرادی اور اجتماعی کوششیں صرف ہو رہی ہیں وہ اکثر ان کے اس ایمان کی ضد ہیں جس کا وہ دعویٰ رکھتے ہیں۔ یہ صورت حال جب تک جاری رہے گی اسلام کے دائرے میں نومسلموں کا داخلہ بھی کوئی مفید نتیجہ پیدا نہ کر سکے گا کیونکہ جو منتشر افراد اس کان نمک میں آتے جائیں گے وہ اسی طرح نمک بنتے چلے جائیں گے۔ پس ہماری دعوت کا ایک لازمی عنصر یہ ہے کہ ہم ہر مدعی ایمان کی زندگی کو ان تناقضات سے پاک دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہمارا مطالبہ ہر مومن سے یہ ہے کہ وہ حنیف ہو، یکسو ہو، یک رنگ مومن و مسلم ہو، ہر اس چیز سے کٹ جائے اور نہ کٹ سکتا ہو تو پیہم کٹنے کی جدوجہد کرتا رہے جو ایمان کی ضد اور مسلمانہ طریق زندگی کے منافی ہو، اور خوب اچھی طرح مقتضیات ایمان میں سے ایک ایک تقاضے کو سمجھے اور اسے پورا کرنے کی پیہم سعی کرتا رہے۔

امامت میں تغیر کی ضرورت اب ہماری دعوت کے تیسرے نکتے کو لیجیے۔ ابھی جن دو نکات کی تشریح میں آپ کے سامنے کر چکا ہوں، یہ تیسرا نکتہ ان سے بالکل ایک منطقی نتیجے کے طور پر نکلتا ہے۔ ہمارا اپنے آپ کو بندگی رب کے حوالے کر دینا اور اس حوالگی و سپردگی میں ہمارا منافق نہ ہونا بلکہ مخلص ہونا اور پھر ہمارا اپنی زندگی کو تناقضات سے پاک کر کے مسلم حنیف بننے کی کوشش کرنا لازمی طور پر اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ ہم اس نظام زندگی میں انقلاب چاہیں، جو آج کفر، دہریت، شرک، فسق و فجور اور بداخلاقی کی بنیادوں پر چل رہا ہے اور جس کے نقشے بنانے والے مفکرین اور جس کا عملی انتظام کرنے والے مدبرین سب کے سب خدا سے پھرے ہوئے اور اس کی شرائع کے قیود سے نکلے ہوئے لوگ ہیں۔ جب تک زمام کار ان لوگوں کے ہاتھ میں رہے گی اور جب تک علوم و فنون، آرٹ اور ادب، تعلیم و تدریس، نشر و اشاعت، قانون سازی اور تنفیذ قانون، مالیات، صنعت و حرفت و تجارت، انتظام ملکی اور تعلقات بین الاقوامی، ہر چیز کی باگ ڈور یہ لوگ سنبھالے ہوئے رہیں گے، کسی شخص کے لیے دنیا میں مسلمان کی حیثیت سے زندگی بسر کرنا اور خدا کی بندگی کو اپنا ضابطہ حیات بنا کر رہنا نہ صرف عملاً محال ہے بلکہ اپنی آئندہ نسلوں کو اعتقاداً بھی اسلام کا پیرو چھوڑ جانا غیر ممکن ہے۔ اس کے علاوہ صحیح معنوں میں جو شخص بندۂ رب ہو اس پر منجملہ دوسرے فرائض کے ایک اہم ترین فرض یہ بھی عائد ہوتا ہے کہ وہ خدا کی رضا کے مطابق دنیا کے انتظام کو فساد سے پاک کرے اور صلاح پر قائم کرے۔ اور یہ ظاہر بات ہے کہ یہ مقصد اس وقت تک پورا نہیں ہو سکتا جب تک کہ زمام کار صالحین کے ہاتھ میں نہ ہو۔ فساق و فجار اور خدا کے باغی اور شیطان

کے مطیع دنیا کے امام و پیشوا اور منتظم رہیں اور پھر دنیا میں ظلم، فساد، بداخلاقی اور گمراہی کا دور دورہ نہ ہو، یہ عقل اور فطرت کے خلاف ہے اور آج تجربہ ومشاہدہ سے کالشمس فی النہار ثابت ہو چکا ہے کہ ایسا ہونا ممکن ہے۔ پس ہمارا مسلم ہونا خود اس بات کا متقاضی ہے کہ ہم دنیا کے ائمہ ضلالت کی پیشوائی ختم کر دینے اور غلبۂ کفر و شرک کو مٹا کر دینِ حق کو اس کی جگہ قائم کرنے کی سعی کریں۔

امامت میں انقلاب کیسے ہوتا ہے؟

اگرچہ یہ تغیر محض چاہنے سے نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت بہرحال دنیا کا انتظام چاہتی ہے اور دنیا کے انتظام کے لیے کچھ صلاحیتیں اور قوتیں اور صفات درکار ہیں جن کے بغیر کوئی گروہ اس انتظام کو ہاتھ میں لینے اور چلانے کے قابل نہیں ہو سکتا۔ اگر مومنین صالحین کا ایک منظم جتھا ایسا موجود نہ ہو جو انتظامِ دنیا کو چلانے کی اہلیت رکھتا ہو تو پھر مشیتِ الٰہی غیر مومن اور غیر صالح لوگوں کو اپنی دنیا کا انتظام سونپ دیتی ہے۔ لیکن اگر کوئی گروہ ایسا موجود ہو جائے جو ایمان بھی رکھتا ہو، صالح بھی ہو اور ان صفات اور صلاحیتوں اور قوتوں میں بھی کفار سے بڑھ جائے جو دنیا کا انتظام چلانے کے لیے ضروری ہیں تو مشیتِ الٰہی نہ ظالم ہے اور نہ فساد پسند کہ پھر بھی اپنی دنیا کا انتظام فساق و فجار اور کفار ہی کے ہاتھ میں رہنے دے۔ پس ہماری دعوت صرف اسی حد تک نہیں ہے کہ دنیا کی زمام کار فساق و فجار کے ہاتھ سے نکل کر مومنین صالحین کے ہاتھ میں آئے بلکہ ایجاباً (Positive) ہماری دعوت یہ ہے کہ اہلِ ایمان و صلاح کا ایک ایسا گروہ منظم کیا جائے جو نہ صرف اپنے ایمان میں پختہ، نہ صرف اپنے اسلام میں مخلص و یکرنگ اور نہ صرف اپنے اخلاق میں صالح و پاکیزہ ہو بلکہ اس کے ساتھ ان تمام اوصاف اور قابلیتوں سے بھی آراستہ ہو جو دنیا کی کارگاہِ حیات کو بہترین طریقے پر چلانے کے لیے ضروری ہیں، اور صرف آراستہ ہی نہ ہو بلکہ موجودہ کارفرماؤں اور کارکنوں سے اُن اوصاف اور قابلیتوں میں اپنے آپ کو فائق تر ثابت کر دے۔

مخالفت اور اس کے اسباب

یہ ہے ہماری دعوت کا خلاصہ۔ اب آپ تعجب کریں گے اگر میں آپ کو بتاؤں کہ اس دعوت کی مزاحمت اور مخالفت سب سے پہلے جس گروہ کی طرف سے ہوئی ہے وہ مسلمانوں کا گروہ ہے۔ اس وقت تک غیر مسلموں کی طرف سے ہمارے خلاف نہ کوئی آواز اٹھی ہے اور نہ عملاً کوئی مزاحمت و مخالفت ہوئی ہے۔ یہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ آئندہ بھی یہی صورتِ حال رہے گی، نہ یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ کب تک یہ صورتِ حال رہے گی، مگر بہرحال یہ واقعہ اپنی جگہ نہایت دردناک اور افسوسناک ہے کہ اس دعوت کو سن کر ناک بھوں چڑھانے والے، اسے اپنے لیے خطرہ سمجھنے والے اور اس کی مزاحمت میں سب سے آگے بڑھ کر سعی کرنے والے غیر مسلم نہیں بلکہ مسلمان ہیں۔ شاید ایسی ہی کچھ صورتِ حال ہو گی جس میں اہلِ کتاب سے فرمایا گیا تھا کہ لَا تَكُونُوا أَوَّلَ كَافِرٍ بِهِ۔ ہمیں ہندوؤں، سکھوں اور انگریزوں تک سے تبادلۂ خیال کا موقع ملا ہے مگر بہت کم ایسا اتفاق ہوا کہ ان لوگوں میں سے کسی نے ہمارے لٹریچر کو پڑھ کر یا ہمارے مدعا کو تفصیل کے ساتھ ہماری زبان سے سن کر یہ کہا ہو کہ "یہ حق نہیں ہے"، یا یہ کہ "اگر تم اس چیز کو قائم کرنے کی کوشش کرو گے تو ہم ایڑی چوٹی تک کا زور تمہاری مزاحمت میں لگا دیں گے"۔ متعدد غیر مسلم ہم کو ایسے بھی ملے ہیں جنھوں نے بے اختیار ہو کر کہا کہ کاش یہی اسلام ہندوستان میں پیش کیا گیا ہوتا اور اسی کو قائم کرنے کے لیے باہر سے آنے والے اور اندر سے قبول کرنے والے مسلمانوں نے کوشش کی ہوتی تو آج ہندوستان کا یہ نقشہ نہ ہوتا اور اس ملک کی تاریخ کچھ اور ہی ہوتی۔ بعض غیر مسلموں نے ہم سے یہاں تک کہا کہ اگر فی الواقع ایسی ایک سوسائٹی موجود ہو جو پوری دیانت کے ساتھ انہی اصولوں پر چلے اور جس کا مرنا اور جینا سب اسی ایک مقصد کے لیے ہو تو ہمیں اس کے اندر شامل ہونے میں کوئی تامل نہ ہو گا۔ لیکن اس کے برعکس ہماری مخالفت میں سرگرم اور ہمارے متعلق بدگمانیاں پھیلانے اور ہم پر ہر طرح کے الزام لگانے والے اگر کسی گروہ میں سب سے پہلے اٹھے تو وہ مسلمانوں کا گروہ ہے اور ان میں بھی سب سے زیادہ یہ شرف مذہبی طبقے کے حضرات کو حاصل ہوا ہے۔ پھر لطف یہ ہے کہ آج تک

کسی کو یہ کہنے کی جرأت نہیں ہوئی کہ جس چیز کی دعوت تم لوگ دیتے ہو وہ باطل ہے۔ شاید اس دعوت پر سامنے سے حملہ (Frontal attack) ممکن ہی نہیں ہے، اس لیے مجبوراً کبھی عقب سے اور کبھی دائیں پہلو سے اور کبھی بائیں جانب سے چھاپہ مارنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ بات تو حق ہے مگر اس کی طرف دعوت دینے والا ایسا اور ویسا ہے۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ اس کے حق ہونے میں تو کلام نہیں مگر اس زمانے میں یہ چلنے والی چیز نہیں ہے۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ حق تو یہی ہے مگر اس کا علَم بلند کرنے کے لیے صحابہ کرام جیسے لوگ درکار ہیں اور وہ بھلا اب کہاں آ سکتے ہیں۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ اس کے صداقت ہونے میں کوئی شبہ نہیں مگر مسلمان اپنی موجودہ سیاسی و معاشی پوزیشن میں اس دعوت کو اپنی واحد دعوت کیسے بنا سکتے ہیں، ایسا کریں تو ان کی دنیا تباہ ہو جائے اور تمام سیاسی اور معاشی زندگی پر غیر مسلم قابض ہو کر ان کے لیے سانس لینے تک کی جگہ نہ چھوڑیں۔ پھر جب اس مسلمان قوم میں سے کوئی اللہ کا بندہ ایسا نکل آتا ہے جو ہماری اس دعوت کو قبول کر کے اپنی زندگی کو واقعی نفاق و تناقض سے پاک کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنی پوری زندگی کو بندگیٔ رب میں دے ڈالنے کا تہیہ کر لیتا ہے تو سب سے پہلے اس کی مخالفت کرنے کے لیے اس کے اپنے بھائی بند، اس کے ماں باپ، اعزا اور اقربا، برادری کے لوگ اور دوست آشنا کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اچھے اچھے متقی اور دیندار آدمی بھی جن کی پیشانیوں پر نمازیں پڑھتے پڑھتے گٹے پڑ چکے ہیں اور جن کی زبانیں مذہبیت کی باتوں سے ہر وقت تر رہتی ہیں اس بات کو گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے کہ ان کا بیٹا یا بھائی یا کوئی عزیز جس کا دنیوی مفاد انھیں کسی درجے میں بھی محبوب ہو اپنے آپ کو اس خطرے میں ڈالے۔

یہ بات کہ اس دعوت کی مخالفت سب سے پہلے مسلمانوں نے کی اور ان کے بھی اہلِ دنیا نے نہیں بلکہ اہلِ دین نے، ایک بہت بڑی بیماری کا پتہ دیتی ہے جو مدتوں سے پرورش پا رہی تھی مگر ظاہر فریب پردوں کے پیچھے چھپی ہوئی تھی۔ آج اگر ہم محض علمی رنگ میں اس دعوت کو پیش کرتے اور یہ نہ کہتے کہ آؤ اس چیز کو عمل میں لانے اور بالفعل قائم کرنے کی کوشش کریں تو آپ دیکھتے کہ مخالفت کے بجائے ان مزیدار علمی باتوں پر ہر طرف سے تحسین و آفرین ہی کی صدائیں بلند ہوتیں۔ بھلا کوئی مسلمان ایسا بھی ہو سکتا ہے جو یہ کہہ سکے کہ بندگی خدا کے سوا کسی اور کی ہونی چاہیے، یا یہ کہ مسلمان کو نفاق کی حالت میں اور منافیٔ ایمان اعمال میں مبتلا رہنا چاہیے، یا یہ کہ زمامِ کار مسلمانوں کے ہاتھ میں نہیں بلکہ کفار ہی کے ہاتھ میں رہنی چاہیے، یا شریعتِ الٰہی کو نہیں کفر ہی کے قوانین کو دنیا میں جاری رہنا چاہیے۔ میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اب تک جن چیزوں کی ہم نے دعوت دی ہے ان میں سے کوئی ایک چیز بھی ایسی نہیں ہے جسے ہم دعوتِ عمل کے بغیر صرف علمی حیثیت سے پیش کرتے تو مسلمانوں میں سے کوئی گروہ بلکہ کوئی فرد اس کے خلاف زبان کھولنے پر آمادہ ہوتا۔ لیکن جس چیز نے لوگوں کو مخالفت پر آمادہ کیا وہ صرف یہ ہے کہ ہم ان باتوں کو فقط علمی رنگ میں ہی نہیں پیش کرتے بلکہ ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ آؤ جس چیز کو از روئے حق جانتے ہو اسے عملاً پہلے اپنی زندگی میں اور پھر اپنے گرد و پیش دنیا کی زندگی میں قائم و جاری کرنے کی کوشش کرو۔ یہ بعینہٖ وہی صورتِ حال ہے جو اس سے پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کے وقت پیش آچکی ہے۔ جو لوگ عرب جاہلیت کے لٹریچر پر نگاہ رکھتے ہیں ان سے یہ بات مخفی نہیں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جس توحید کی دعوت دی تھی اور جن اصولِ اخلاق کو آپ پیش فرماتے تھے وہ عرب میں بالکل کوئی نئی چیز نہ تھے۔ اسی قسم کے موحدانہ خیالات زمانۂ جاہلیت کے متعدد شعراء اور خطیب پیش کر چکے تھے اور اسی طرح اسلامی اخلاقیات میں سے بھی بیشتر وہ تھے جن کو اہلِ عرب کے حکماء اور خطباء اور شعراء بیان کرتے رہے تھے۔ مگر فرق جو کچھ تھا وہ یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک طرف تو باطل کی آمیزشوں سے الگ کر کے خالص حق کو ایک مکمل و مرتب نظامِ زندگی کی شکل میں لوگوں کے سامنے پیش کیا، اور دوسری

طرف آپ نے یہ بھی چاہا کہ جس توحید کو ہم حق کہتے ہیں اس کے مخالف عناصر کو ہم اپنی زندگی سے خارج کر دیں، اور سارے نظامِ زندگی کو اسی توحید کی بنیاد پر تعمیر کریں۔ نیز یہ کہ جن اصولِ اخلاق کو ہم معیار تسلیم کرتے ہیں ہماری پوری زندگی کا نظام بھی انہی اصولوں پر عملاً قائم ہو۔ یہی سبب تھا کہ جن باتوں کے کہنے پر زمانۂ جاہلیت کے کسی خطیب، کسی شاعر اور کسی حکیم کی مخالفت نہیں کی گئی بلکہ الٹا انھیں سراہا گیا، انہی باتوں کو جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیا تو ہر طرف سے مخالفتوں کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا، کیونکہ لوگ اس بات کے لیے تیار نہیں تھے کہ شرک پر جو نظامِ زندگی قائم تھا اسے بالکل ادھیڑ کر از سرِ نو توحید کی بنیادوں پر قائم کیا جائے اور اس طرح ان تمام تعصبات اور آبائی رسموں کا، امتیازات اور "حقوق" اور مناصب کا اور اعزازات و اکرامات اور معاشی مفادات کا یک لخت خاتمہ ہو جائے جو صدہا برس سے عہدِ جاہلیت میں زندگی کی بنیاد بنے ہوئے تھے اور جن سے بعض طبقوں اور خاندانوں کی اغراض وابستہ تھیں۔ اسی طرح لوگ اس بات کے لیے بھی تیار نہیں تھے کہ اخلاقِ فاسدہ کے رواج سے جو آسائشیں اور لذتیں اور منفعتیں اور آزادیاں ان کو حاصل ہیں ان سے دست بردار ہو جائیں اور اخلاقِ صالحہ کی بندشوں میں اپنے آپ کو خود کسوا دیں۔

یہ معاملہ صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ساتھ پیش نہیں آیا بلکہ حضور سے پہلے جتنے نبی گذرے ہیں ان کی مخالفت بھی زیادہ تر اسی مسئلے پر ہوئی ہے۔ اگر انبیاء صرف علمی اور ادبی حیثیت سے توحید اور آخرت اور اخلاقِ فاضلہ کا ذکر کرتے تو ان کے زمانے کی سوسائٹیاں اسی طرح ان کو برداشت کرتیں بلکہ سر آنکھوں پر بٹھاتیں جس طرح انھوں نے مختلف قسم کے شاعروں اور فلسفیوں اور ادیبوں کو سر آنکھوں پر بٹھایا۔ لیکن ہر نبی کا مطالبہ ان باتوں کے ساتھ یہ بھی تھا کہ اتقوا اللہ واطیعون (اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو) اور لا تطیعوا امر المسرفین (حد سے گزرنے والوں کی اطاعت نہ کرو) اور اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم ولا تتبعوا من دونہ اولیاء (جو ہدایت تمہاری طرف تمہارے رب کی طرف سے نازل ہوئی ہے اس کی پیروی کرو اور اپنے رب کے سوا دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو)۔ اور پھر انبیاء نے اس پر بھی اکتفا نہ کیا بلکہ ایک مستقل تحریک اسی مقصد کو پورا کرنے کے لیے جاری کی اور اپنے پیروؤں کے جتھے منظم کر کے عملاً نظامِ تہذیب و تمدن و اخلاق کو اپنے نصب العین کے مطابق بدل ڈالنے کی جدوجہد شروع کر دی۔ بس یہی وہ نقطہ تھا جہاں سے ان لوگوں کی مخالفت کا آغاز ہوا جن کے مفاد نظامِ جاہلیت سے کلی یا جزئی طور پر وابستہ تھے، اور آج ہم مشاہدہ کر رہے ہیں کہ ٹھیک یہی نقطہ ہے جہاں سے ہماری مخالفت کی ابتدا ہوئی ہے۔ مسلمانوں نے ایک طویل مدت سے اپنی پوری زندگی کی عمارت ان بہت سی مصالحتوں (Compromises) پر قائم کر رکھی ہے جو نظامِ جاہلیت کے اور ان کے درمیان طے ہو چکے ہیں۔ یہ مصالحتیں صرف دنیا دارانہ ہی نہیں ہیں بلکہ انھوں نے اچھی خاصی مذہبی نوعیت بھی اختیار کر لی ہے۔ بڑے بڑے مقدس لوگ جن کے تقدس کی قسمیں کھائی جا سکتی ہیں، ان مصالحتوں میں پھنسے ہوئے ہیں۔ نظامِ باطل کی وابستگی کے ساتھ تقویٰ اور عبادت کے چند مظاہر اس قدر کافی قرار دیے جا چکے ہیں کہ بکثرت لوگ اپنی محدود پرہیزگاریوں اور عبادت گزاریوں پر اپنی نجات کی طرف سے مطمئن بیٹھے ہوئے ہیں۔ بہت سے اربابِ فضل اور اصحابِ مقاماتِ عالیہ ایسے موجود ہیں جن کی بزرگی اور روحانیت، اور جن کے اونچے مراتب، نظامِ جاہلیت کے ساتھ مصالحت کر لینے کے باوجود قائم ہیں۔ زبان سے کفر و جاہلیت اور فسق و فجور اور بد اعتقادیوں اور ضلالتوں کی مذمت کر لینا اور عہدِ صحابہ کے نقشے بڑی طلاقتِ لسانی کے ساتھ اپنے وعظوں اور اپنی تحریروں میں کھینچ دینا اسلام کا حق ادا کرنے کے لیے بالکل کافی ہو چکا ہے اور اس کے بعد ان حضرات کے لیے بالکل حلال ہے کہ خود اپنے آپ کو اور اپنی اولاد کو اور اپنے متعلقین اور اپنے پیروؤں کو اسی نظامِ باطل کی خدمت میں لگا دیں جس کے لائے ہوئے سیلابِ ضلالت و گمراہی اور طوفانِ فسق و فجور کی یہ دن رات مذمت کرتے رہتے ہیں۔ ان حالات میں جب ہم دینِ حق اور اس کے مطالبات اور مقتضیات کو محض علمی حیثیت ہی سے پیش کرنے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ یہ دعوت بھی دیتے ہیں کہ غلط نظام

کے ساتھ وہ تمام مصالحتیں ختم کردو جو تم نے کر رکھی ہیں اور کامل یکسوئی و یکرنگی کے ساتھ حق کی پیروی اختیار کرو اور پھر اس باطل کی جگہ اس حق کو قائم کرنے کے لیے جان و مال اور وقت و محنت کی قربانی دو جس پر تم ایمان لائے ہو، تو ظاہر ہے کہ یہ قصور ایسا نہیں ہے جسے معاف کیا جا سکے۔ اگر سیدھی طرح یہ تسلیم کرلیا جائے کہ واقعی دین کے مطالبات اور مقتضیات یہی ہیں اور حقیقت میں حنیفیت اسی کو کہتے ہیں اور اصل بات یہی ہے کہ نظام باطل کے ساتھ مومن کا تعلق مصالحت کا نہیں بلکہ نزاع و کشمکش کا ہونا چاہیے، تو پھر دو صورتوں میں سے ایک صورت اختیار کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے، یا تو اپنے مفاد کی قربانی گوارا کر کے اس جد و جہد میں حصہ لیا جائے اور ظاہر ہے کہ یہ بہت جانگسل بات ہے، یا پھر اعتراف کر لیا جائے کہ حق تو یہی ہے مگر ہم اپنی کمزوری کی وجہ سے اس کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ لیکن یہ اعتراف بھی مشکل ہے کیونکہ ایسا کرنے سے صرف یہی نہیں کہ نجات کی وہ گارنٹی خطرے میں پڑ جاتی ہے جس کے اطمینان پر اب تک زندگی بسر کی جا رہی تھی بلکہ اس طرح وہ مقام تقدس بھی خطرے میں پڑ جاتا ہے جو مذہبی و روحانی حیثیت سے ان حضرات کو حاصل رہا ہے اور یہ چیز بھی بہرحال ٹھنڈے پیٹوں گوارا نہیں کی جا سکتی۔ اس لیے ایک بڑے گروہ نے مجبوراً یہ تیسری راہ اختیار کی ہے کہ صاف صاف ہماری اس دعوت کو باطل تو نہ کہا جائے کیونکہ باطل کہنے کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے، لیکن صاف صاف اس کے حق ہونے کا بھی اعتراف نہ کیا جائے، اور اگر کہیں اس کی حقانیت کا اقرار کرنا پڑ ہی جائے تو پھر اصول کو چھوڑ کر کسی شخص یا اشخاص کو بدگمانیوں اور الزامات کا ہدف بنایا جائے تاکہ خود اپنے ہی مانے ہوئے حق کا ساتھ نہ دینے کے لیے وجہ جواز پیدا ہو جائے۔ کاش یہ حضرات کبھی اس بات پر غور فرماتے کہ جو حجتیں آج بندوں کا منہ بند کرنے کے لیے وہ پیش کرتے ہیں کل قیامت کے روز کیا وہ خدا کا منہ بھی بند کر دیں گی۔

ہمارا طریق کار اب میں آپ کے سامنے مختصر طور پر اس "طریق کار" کو پیش کروں گا جو ہم نے اپنی اس دعوت کے لیے اختیار کیا ہے۔ ہماری دعوت کی طرح ہمارا یہ طریق کار بھی دراصل قرآن اور انبیاء علیہم السلام کے طریقے سے ماخوذ ہے۔ جو لوگ ہماری دعوت کو قبول کرتے ہیں ان سے ہمارا اولین مطالبہ یہی ہوتا ہے کہ اپنے آپ کو عملاً اور بالکلیہ بندگی رب میں دیدو اور اپنے عمل سے اپنے اخلاص اور اپنی یکسوئی کا ثبوت دو اور ان تمام چیزوں سے اپنی زندگی کو پاک کرنے کی کوشش کرو جو تمہارے ایمان کی ضد ہیں۔ یہیں سے ان کے اخلاق و سیرت کی تعمیر اور ان کی آزمائش کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ جن لوگوں نے بڑی بڑی امنگوں (Ambitions) کے ساتھ اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی انھیں اپنے اونچے اونچے خوابوں کی عمارتیں اپنے ہاتھ سے ڈھا دینی پڑتی ہیں اور اس زندگی میں قدم رکھنا پڑتا ہے جس میں جاہ و منصب اور معاشی خوشحالیوں کے امکانات انھیں اپنی زندگی میں تو درکنار اپنی دوسری تیسری پشت میں بھی دور دور نظر نہیں آتے۔ جن لوگوں کی معاشی خوشحالی کسی مرہونہ زمین یا کسی مغصوبہ جائداد یا کسی ایسی میراث پر قائم تھی جس میں حقداروں کے حقوق مارے گئے تھے انھیں بسا اوقات دامن جھاڑ کر اس خوشحالی سے کنارہ کش ہو جانا پڑتا ہے صرف اس لیے کہ جس خدا کو انھوں نے اپنا آقا تسلیم کیا ہے اس کے منشا کے خلاف کسی مال کا کھانا ان کے ایمان کے منافی ہے۔ جن لوگوں کے وسائل زندگی غیر شرعی تھے یا نظام باطل سے وابستہ تھے ان کو ترقیوں کے خواب دیکھنا تو درکنار موجودہ وسائل سے حاصل کی ہوئی روٹی کا بھی ایک ایک ٹکڑا حلق سے اتارنا ناگوار ہونے لگتا ہے اور وہ ان وسائل کو پاک تر وسائل سے خواہ وہ حقیر ترین ہی کیوں نہ ہوں، بدلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگتے ہیں۔ پھر جیسا کہ ابھی میں آپ کے سامنے بیان کر چکا ہوں، اس مسلک کو عملاً اختیار کرتے ہی آدمی کا قریب ترین ماحول اس کا دشمن بن جاتا ہے۔ اس کے اپنے والدین، اس کے بھائی بند، اس کی بیوی اور بچے اور اس کے جگری دوست سب سے پہلے اس کے ایمان سے قوت آزمائی شروع کر دیتے ہیں اور بسا اوقات

اس مسلک کا پہلا اثر ظاہر ہوتے ہی آدمی کا اپنا گھوارہ جس میں وہ نازوں سے پالا گیا تھا اس کے لیے زنبور خانہ بن کر رہ جاتا ہے۔ یہ پہلی ابتدائی تربیت گاہ جو صالح و مخلص اور قابل اعتماد سیرت کے کارکن فراہم کرنے کے لیے قدرت الٰہی نے ہمارے لیے خود بخود پیدا کر دی ہے۔ ان ابتدائی آزمائشوں میں جو لوگ ناکام ہو جاتے ہیں وہ آپ سے آپ چھٹ کر الگ ہو جاتے ہیں اور ہمیں ان کو چھانٹ پھینکنے کی زحمت گوارا نہیں کرنی پڑتی۔ اور جو لوگ ان میں پورے اترتے ہیں وہ ثابت کر دیتے ہیں کہ ان کے اندر کم از کم اتنا اخلاص، اتنی یکسوئی، اتنا صبر اور عزم، اتنی محبت حق اور اتنی مضبوط سیرت ضرور موجود ہے جو خدا کی راہ میں قدم رکھنے اور پہلے مرحلہ امتحان سے کامیاب گذر جانے کے لیے ضروری ہے۔ اس مرحلے کے کامیاب لوگوں کو ہم نسبتاً زیادہ بھروسے اور اطمینان کے ساتھ لے کر دوسرے مرحلے کی طرف پیشقدمی کر سکتے ہیں جو آگے آنے والا ہے اور جس میں اس سے زیادہ آزمائشیں پیش آنے والی ہیں۔ وہ آزمائشیں پھر ایک دوسری بھٹی تیار کریں گی جو اسی طرح کھوٹے سکوں کو چھانٹ کر پھینک دے گی اور زر خالص کو اپنی گود میں رکھ لے گی۔ جہاں تک ہمارا علم ساتھ دیتا ہے ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ انسانی معادن سے کار آمد عناصر کو چھانٹنے اور ان کو زیادہ کار آمد بنانے کے لیے یہی طریقہ پہلے بھی اختیار کیا جاتا رہا ہے اور جو تقویٰ ان بھٹیوں میں تیار ہوتا ہے چاہے وہ فقہی ناپ تول میں پورا نہ اترے، اور خانقاہی معیاروں پر بھی ناقص نکلے، مگر صرف اسی طرز سے تیار کیے ہوئے تقویٰ میں یہ طاقت ہو سکتی ہے کہ انتظام دنیا کی بھاری ذمہ داریوں کا بوجھ سنبھال سکے اور ان عظیم الشان امانتوں کا بار اٹھا سکے جن کے ایک قلیل سے قلیل جز کا وزن بھی خانقاہی تقویٰ کی برداشت سے باہر ہے۔

اس کے ساتھ دوسری چیز جو ہم اپنے ارکان پر لازم کرتے ہیں یہ ہے کہ جس حق کی روشنی انھوں نے پائی ہے اس سے وہ اپنے قریبی ماحول کو اور ان سب لوگوں کو جن سے ان کا قرابت یا دوستی یا ہمسائگی یا لین دین کا تعلق ہے، روشناس کرانے کی کوشش کریں اور انھیں اس کی طرف آنے کی دعوت دیں۔ یہاں پھر آزمائشوں کا ایک سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ سب سے پہلے تو اس تبلیغ کی وجہ سے مبلغ کی اپنی زندگی درست ہوتی ہے کیونکہ یہ کام شروع کرتے ہی بے شمار خورد بین اور دیدبان (Search lights) اس کی ذات کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں اور مبلغ کی زندگی میں اگر کوئی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی اس کے ایمان اور اس کی دعوت کے منافی موجود ہو تو یہ مفت کے محتسب اسے نمایاں کر کے مبلغ کے سامنے رکھ دیتے ہیں اور تازیانے لگا لگا کر اسے مجبور کرتے ہیں کہ اپنی زندگی کو اس سے پاک کرے۔ اگر مبلغ فی الواقع اس دعوت پر سچے دل سے ایمان لایا ہو تو وہ ان تنقیدوں پر جھنجھلانے اور تاویلوں سے اپنے عمل کی غلطی کو چھپانے کی کوشش نہ کرے گا بلکہ ان لوگوں کی خدمات سے فائدہ اٹھائے گا جو مخالفت کی نیت ہی سے سہی مگر بہرحال اس کی اصلاح میں بغیر کسی معاوضے کے سعی و محنت صرف کرتے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جس برتن کو بیسیوں ہاتھ مانجھنے میں لگ جائیں اور مانجھتے ہی چلے جائیں وہ چاہے کتنا ہی کثیف ہو آخر کار مجلا و مصفا ہو کر رہے گا۔

پھر اس تبلیغ سے ہمارے کارکنوں میں بہت سے ان اوصاف کو بالیدگی حاصل ہوتی ہے جنھیں آگے چل کر دوسرے میدانوں میں کسی اور شکل سے ہم کو استعمال کرنا ہے۔ جب مبلغ کو طرح طرح کے دل شکن حالات سے گذرنا پڑتا ہے، کہیں اس کی ہنسی اڑائی جاتی ہے، کہیں اس پر طعنے اور آوازے کسے جاتے ہیں، کہیں گالیوں اور دوسری جہالتوں سے اس کی تواضع کی جاتی ہے، کہیں اس پر الزامات کی بوچھاڑ کی جاتی ہے، کہیں اس کو فتنوں میں الجھانے کی نت نئی تدبیریں کی جاتی ہیں، کہیں اسے گھر سے نکال دیا جاتا ہے، میراث سے محروم کیا جاتا ہے، دوستیاں اور رشتہ داریاں اس سے منقطع کر لی جاتی ہیں اور اس کے لیے اپنے ماحول میں سانس تک لینا دشوار کر دیا جاتا ہے، تو ان حالات میں جو کارکن نہ ہمت ہارے، نہ حق سے پھرے، نہ باطل پرستوں کے آگے سپر ڈالے، نہ مشتعل ہو کر اپنے دماغ کا توازن کھوئے،

بلکہ اس کے برعکس حکمت اور تدبر اور ثابت قدمی اور راست بازی اور پرہیزگاری اور ایک سچے حق پرست کی سی ہمدردی و خیرخواہی کے ساتھ اپنے مسلک پر قائم اور اپنے ماحول کی اصلاح میں پیہم کوشاں رہے۔ اس کے اندر اُن اوصافِ عالیہ کا پیدا ہونا اور نشوونما پانا یقینی ہے جو آگے چل کر ہماری اس جدوجہد کے دوسرے مرحلوں میں اس سے بہت زیادہ بڑے پیمانے پر درکار ہوں گے۔

اس تبلیغ کے سلسلے میں ہم نے وہی طریق کار اپنے کارکنوں کو سکھانے کی کوشش کی ہے جو قرآن مجید میں تعلیم فرمایا گیا ہے، یعنی یہ کہ حکمت اور موعظۂ حسنہ کے ساتھ خدا کے راستے کی طرف دعوت دیں۔ تدریج اور فطری ترتیب کو ملحوظ رکھتے ہوئے لوگوں کے سامنے دین کے اولین بنیادی اصولوں کو اور پھر رفتہ رفتہ ان کے مقتضیات اور لوازم کو پیش کریں۔ کسی کو اس کی قوت ہضم سے بڑھ کر خوراک دینے کی کوشش نہ کریں۔ فروع کو اصول پر اور جزئیات کو کلیات پر مقدم نہ کریں۔ بنیادی خرابیوں کو رفع کیے بغیر ظاہری برائیوں اور بیرونی شاخوں کو چھانٹنے اور کاٹنے میں اپنا وقت ضائع نہ کریں۔ غفلت اور اعتقادی و عملی گمراہیوں میں پھنسے ہوئے لوگوں کے ساتھ نفرت و کراہیت کا برتاؤ کرنے کے بجائے ایک طبیب کی سی ہمدردی و خیرخواہی کے ساتھ ان کے علاج کی فکر کریں۔ گالیوں اور پتھروں کے جواب میں دعائے خیر کریں۔ ظلم اور ایذا رسانی پر صبر کریں۔ جاہلوں سے بحثوں اور مناظروں اور نفسانی مجادلوں میں نہ الجھیں۔ لغو اور بیہودہ باتوں سے عالی ظرف اور شریف لوگوں کی طرح درگزر کریں۔ جو لوگ حق سے مستغنی بنے ہوئے ہیں ان کے پیچھے پڑنے کے بجائے اُن لوگوں کی طرف توجہ کریں جن کے اندر کچھ طلب حق پائی جاتی ہو خواہ وہ دنیوی اعتبارات سے کتنے ہی ناقابل توجہ سمجھے جاتے ہوں۔ اور اپنی اس تمام سعی و جہد میں ریاء، نمود و نمائش سے بچیں، اپنے کارناموں کو گنانے اور فخر کے ساتھ ان کا مظاہرہ کرنے اور لوگوں کی توجہات اپنی طرف کھینچنے کی ذرہ برابر کوشش نہ کریں۔ بلکہ جو کچھ کریں اس نیت اور اس یقین و اطمینان کے ساتھ کریں کہ ان کا سارا عمل خدا کے لیے ہے اور خدا بہرحال ان کی خدمات سے بھی واقف ہے اور ان خدمات کی قدر بھی اسی کے ہاں ہونی ہے خواہ خلق اس سے واقف ہو یا نہ ہو اور خلق کی طرف سے سزا ملے یا جزا۔

یہ طریق کار غیر معمولی صبر اور تحمل اور لگاتار محنت چاہتا ہے۔ اس میں ایک مدت دراز تک مسلسل کام کرنے کے بعد بھی شاندار نتائج کی وہ ہری بھری فصل لہلہاتی نظر نہیں آتی جو طبلی اور نمائشی کام شروع کرتے ہی دوسرے دن سے تماشائیوں اور مداریوں کا دل لبھانا شروع کر دیتی ہے۔ اس میں ایک طرف خود کارکن کے اندر وہ گہری بصیرت، وہ سنجیدگی، وہ پختہ کاری اور وہ معاملہ فہمی پیدا ہوتی ہے جو اس تحریک کے زیادہ صبر آزما اور زیادہ محنت و حکمت چاہنے والے مراحل میں درکار ہونے والی ہے، اور دوسری طرف اس سے تحریک اگرچہ آہستہ رفتار سے چلتی ہے مگر اس کا ایک ایک قدم مستحکم ہوتا چلا جاتا ہے۔ صرف ایسے ہی طریق تبلیغ سے سوسائٹی کا مکھن نکال کر تحریک میں جذب کیا جا سکتا ہے۔ اوچھے اور سطحی لوگوں کی بھیڑ جمع کرنے کے بجائے اس طریق تبلیغ سے سوسائٹی کے صالح ترین عناصر تحریک کی طرف کھنچتے ہیں اور وہ سنجیدہ (Serious) کارکن تحریک کو میسر آتے ہیں جن میں سے ایک ایک آدمی کی شرکت ہزار بوالفضولوں کے انبوہ سے زیادہ قیمتی ہوتی ہے۔

ہمارے طریق کار کا ایک بڑا اہم جزیہ ہے کہ ہم نے اپنے آپ کو نظام باطل کی قانونی اور عدالتی حفاظت سے خود بخود محروم کر لیا ہے اور علی الاعلان دنیا کو بتا دیا ہے کہ ہم اپنے انسانی حقوق، اپنے مال و جان اور عزت و آبرو کسی چیز کی عصمت بھی قائم رکھنے کے لیے اس نظام کی مدد حاصل کرنا نہیں چاہتے جس کو ہم باطل سمجھتے ہیں۔ لیکن اس چیز کو ہم نے تمام ارکان پر لازم نہیں کیا ہے بلکہ ان کے سامنے ایک بلند معیار رکھ دینے کے بعد ان کو اختیار دے دیا ہے کہ چاہیں تو اس معیار کی انتہائی بلندیوں تک پہنچ جائیں ورنہ حالات کی مجبوریوں سے شکست کھا کر جس قدر پستی میں گرنا چاہیں گرتے چلے جائیں۔ البتہ پستی کی ایک حد ہم نے مقرر کر دی ہے کہ اس سے گر جانے والے

کو ہم اپنی جماعت میں نہ رکھیں گے، یعنی ایسا شخص جو جھوٹا مقدمہ بنائے، یا جھوٹی شہادت دے، یا ایسی مقدمہ بازی میں الجھے جس کے لیے کسی مجبوری کا عذر نہ پیش کیا جاسکے بلکہ وہ سراسر منفعت طلبی یا نفسانیت کی تسکین یا دوستی اور رشتہ داری کی عصبیت ہی پر مبنی ہو، ہماری جماعت میں جگہ نہیں پا سکتا۔

بظاہر لوگ ہمارے اس طریق کار کی حکمتوں کو جو ہم نے قانون و عدالت کے معاملے میں اختیار کیا ہے پوری طرح نہیں سمجھتے اس لیے وہ طرح طرح کے سوالات ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ مگر فی الحقیقت اس کے بے شمار فائدے ہیں۔ اس کا اولین فائدہ یہ ہے کہ ہم اپنا ایک با اصول جماعت ہونا اپنے عمل سے اور ایسے عمل سے ثابت کر دیتے ہیں جو محض تفریحی نوعیت ہی نہیں رکھتا بلکہ صریح طور پر نہایت تلخ اور انتہائی کڑی آزمائشیں اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ خدا کے سوا کسی کو انسانی زندگی کے لیے قانون بنانے کا حق نہیں ہے، اور جب ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ حاکمیت (Sovereignty) صرف خدا کا حق ہے اور خدا کی اطاعت اور اس کے قانون کی پابندی کے بغیر کوئی زمین میں حکم چلانے کا مجاز نہیں ہے، اور جب ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ جو قانونِ الٰہی کی سند کے بغیر معاملات انسانی کا فیصلہ کرے وہ کافر اور فاسق اور ظالم ہے تو ہمارے اس عقیدے اور ہمارے اس دعوے سے خود بخود یہ بات لازم آجاتی ہے کہ ہم اپنے حقوق کی بنیاد کسی غیر الٰہی قانون پر نہ رکھیں اور حق اور غیر حق کا فیصلہ کسی ایسے حاکم کی حکومت پر نہ چھوڑیں جس کو ہم باطل سمجھتے ہیں۔ اپنے عقیدے کے اس تقاضے کو اگر ہم سخت سے سخت نقصانات اور انتہائی خطرات کے مقابلے میں بھی پورا کر کے دکھا دیں تو یہ ہماری راستی اور ہماری مضبوطیِ سیرت اور ہمارے عقیدے اور عمل کی مطابقت کا ایسا بین ثبوت ہوگا جس سے بڑھ کر کسی دوسرے ثبوت کی حاجت نہیں رہتی۔ اور اگر کسی نفع کی امید یا کسی نقصان کا خطرہ یا کسی ظلم و ستم کی چوٹ ہم کو مجبور کر دے کہ ہم اپنے عقیدے کے خلاف کام کر گذریں تو یہ ہماری کمزوری کا اور ہماری سیرت کے بودے پن کا بھی ایک نمایاں ترین ثبوت ہوگا جس کے بعد کسی دوسرے ثبوت کی ضرورت نہ رہے گی۔

اس کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اپنے ارکان کی پختگی اور ان کے قابلِ اعتماد یا ناقابلِ اعتماد ہونے کا اندازہ کرنے کے لیے ہمارے پاس یہ ایک ایسی کسوٹی ہوگی جس سے ہم بآسانی یہ معلوم کرتے رہیں گے کہ ہم میں سے کون لوگ کتنے پختہ ہیں اور کس سے کس قسم کی آزمائشوں میں ثابت قدم رہنے کی توقع کی جاسکتی ہے۔

اس کا تیسرا اور عظیم الشان فائدہ یہ ہے کہ ہمارے ارکان یہ مسلک اختیار کرنے کے بعد آپ سے آپ اس بات پر مجبور ہو جائیں گے کہ سوسائٹی کے ساتھ اپنے تعلقات کو قانون کی بنیادوں پر قائم کرنے کے بجائے اخلاق کی بنیادوں پر قائم کریں۔ ان کو اپنا اخلاقی معیار اتنا بلند کرنا پڑے گا، اپنے آپ کو اپنے ماحول میں اس قدر راست باز، اتنا متدین، اتنا امین، اتنا خدا ترس اور اس قدر خیرِ مجسم بنانا پڑے گا کہ لوگ خود بخود ان کے حقوق اور ان کی عزت اور ان کی جان و مال کا احترام کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ کیونکہ اس اخلاقی تحفظ کے سوا ان کے لیے دنیا میں اور کوئی تحفظ نہ ہوگا اور قانونی تحفظ سے محروم ہونے اور پھر اخلاقی تحفظ بھی حاصل نہ کرنے کی صورت میں ان کی حیثیت دنیا میں بالکل ایسی ہو کر رہ جائے گی جیسے جنگل میں ایک بکری بھیڑیوں کے درمیان رہتی ہو۔

اس کا چوتھا فائدہ یہ ہے اور یہ بھی کچھ کم اہم نہیں ہے کہ ہم اس طرح اپنے آپ کو اور اپنے مفاد اور حقوق کو خطرے میں ڈال کر موجودہ سوسائٹی کی اخلاقی حالت کو بالکل برہنہ کر کے دنیا کے سامنے رکھ دیں گے۔ جب لوگ یہ جاننے کے بعد کہ ہم پولیس اور عدالت سے اپنی حفاظت کے لیے کوئی مدد لینے والے نہیں ہیں، ہمارے حقوق پر علی الاعلان ڈاکے ماریں گے تو یہ اس بات کا نمایاں ترین ثبوت ہوگا کہ ہمارے ملک کی اور ہماری

سوسائٹی کی اخلاقی حالت کس قدر کھوکھلی ہے۔ کتنے آدمی ہیں جو صرف اس وجہ سے شریف بنے ہوئے ہیں کہ قانون نے ان کو شریف بنا رہنے پر مجبور کر رکھا ہے۔ کتنے آدمی ہیں جو ہر قسم کی خیانت اور بے ایمانی کرنے پر آمادہ ہو سکتے ہیں، بشرطیکہ ان کو اطمینان ہو جائے کہ دنیا میں کوئی ان پر گرفت کرنے والا نہیں ہے۔ کتنے آدمی ہیں جنھوں نے مذہب اور اخلاق اور انسانیت کے جھوٹے لبادے اوڑھ رکھے ہیں حالانکہ اگر موقع میسر آجائے اور کوئی رکاوٹ موجود نہ ہو تو ان سے بدترین بد اخلاقی اور لامذہبیت اور حیوانیت کا صدور نہایت آسانی کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ یہ اخلاقی ناسور جو چھپا ہوا ہے اور اندر ہی اندر ہماری قومی سیرت کو گلا اور سڑا رہا ہے ہم اس کو علی رؤس الاشہاد بے پردہ کر کے رکھ دیں گے تاکہ ہمارے ملک کا اجتماعی ضمیر چونک پڑے اور اسے ٹھیک ٹھیک اندازہ ہو کہ جس مرض سے وہ اب تک غفلت برت رہا ہے وہ کتنی دور پہنچ چکا ہے۔

صاحبو! اپنی دعوت اور اپنے طریق کار کی یہ مختصر تشریح میں نے آپ کے سامنے پیش کر دی ہے۔ آپ اس کو جانچیں اور پرکھیں اور اس پر کڑی سے کڑی تنقید کریں اور دیکھیں کہ ہم کس چیز کی طرف بلا رہے ہیں، اور بلانے کے لیے ہم نے جو ڈھنگ اختیار کیا ہے وہ کہاں تک صحیح ہے، کس حد تک خدا اور رسول کی تعلیمات کے مطابق ہے، کس حد تک موجودہ انفرادی و اجتماعی امراض کا صحیح علاج ہے، اور کس حد تک اس سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ ہم اپنے آخری مقصود یعنی کلمۃ اللہ کے بلند اور کلمات باطلہ کے پست ہو جانے کو حاصل کر سکتے ہیں۔ اب میں ان شبہات و اعتراضات پر کچھ عرض کروں گا جو اسی اجتماع کے دوران میں بعض رفقاء اور ہمدردوں کے ذریعے سے مجھ تک پہنچائے گئے ہیں۔

علماء اور مشائخ کی آڑ

ایک اعتراض جو پہلے بھی بارہا سن چکا ہوں اور آج بھی وہ میرے پاس تحریری شکل میں آیا ہے، یہ ہے کہ "ایسے بڑے بڑے علماء اور پیشوایانِ دین (جن کے کچھ نام بھی گنائے گئے ہیں) کیا دین سے اس قدر ناواقف تھے کہ نہ صرف یہ کہ خود انھوں نے دین کے اُن تقاضوں کو جو تم بیان کرتے ہو نہیں سمجھا اور پورا کرنے کی طرف توجہ نہیں کی بلکہ تمھارے بیان کرنے کے بعد بھی انھوں نے اسے تسلیم نہیں کیا اور نہ تمھارے ساتھ تعاون کرنا قبول کیا؟ کیا یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ سب دین سے ناواقف ہیں؟ یا اس بات کا کہ تم نے خود دین کے نام سے ایک ایسی چیز پیش کی ہے جو مقتضیاتِ دین میں سے نہیں ہے؟" اس سوال کا بہت مختصر جواب میرے پاس یہ ہے کہ میں نے دین کو حال یا ماضی کے اشخاص سے سمجھنے کے بجائے ہمیشہ قرآن اور سنت ہی سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اس لیے میں کبھی یہ معلوم کرنے کے لیے کہ خدا کا دین مجھ سے اور ہر مومن سے کیا چاہتا ہے، یہ دیکھنے کی کوشش نہیں کرتا کہ فلاں اور فلاں بزرگ کیا کہتے ہیں اور کیا کرتے ہیں بلکہ صرف یہ دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں کہ قرآن کیا کہتا ہے اور رسول نے کیا کیا؟ اسی ذریعہ معلومات کی طرف میں آپ لوگوں کو بھی توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ آپ یہ دیکھیے کہ جس چیز کی طرف میں آپ کو دعوت دے رہا ہوں اور جو طریق کار اس کے لیے پیش کر رہا ہوں آیا قرآن کی دعوت وہی ہے اور انبیاء علیہم السلام کا طریق کار وہی رہا ہے یا نہیں۔ اگر قرآن و سنت سے یہ بات ثابت ہو جائے، اور آپ کے نزدیک قرآن و سنت ہی اصل ذریعۂ ہدایت ہوں تو میری بات مانیے اور میرے ساتھ آجائیے، اور اگر اس دعوت اور اس طریق کار میں کوئی چیز قرآن و سنت سے ہٹی ہوئی ہو تو بے تکلف اسے ظاہر کر دیجیے۔ جس وقت مجھ پر اور میرے رفقاء پر یہ منکشف ہو جائے گا کہ ہم کہیں بال برابر بھی قرآن اور سنت سے ہٹے ہیں تو آپ ان شاء اللہ دیکھ لیں گے کہ ہم حق کی طرف رجوع کرنے میں ایک لمحے کے لیے بھی تامل کرنے والے نہیں ہیں۔ لیکن اگر آپ حق و باطل کا فیصلہ خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کی بجائے اشخاص پر رکھنا چاہتے ہیں تو آپ کو پورا اختیار ہے کہ اپنے آپ کو اور اپنے مستقبل کو اشخاص ہی کے حوالے کر دیجیے اور خدا کے ہاں بھی یہی جواب دیجیے گا کہ ہم نے اپنا دین تیری کتاب اور تیرے رسول کی سنت کے بجائے فلاں اور فلاں لوگوں کے حوالے کر دیا تھا۔ یہ جواب دہی اگر آپ کو خدا کے ہاں بچا سکتی ہے تو اسی پر اطمینان سے کام کرتے رہیے۔

زہد کا طعنہ ایک اور اعتراض جس کے متعلق مجھے لکھا گیا ہے کہ ایک مخلص ہمدرد نے اسے پیش کیا ہے یہ ہے کہ "تمہاری جماعت محض چند زہاد اور تارکین دنیا کی ایک جماعت ہے جو دنیا کے معاملات سے بے تعلق ہو کر ایک طرف بیٹھ گئی ہے اور جسے سیاسیات حاضرہ سے کوئی بحث نہیں ہے، درانحالیکہ مسلمانوں کو حالات نے مجبور کر دیا ہے کہ بغیر ایک لمحہ ضائع کیے ان مسائل سیاسی کو حل کریں جن کے حل پر پوری قوم کے مستقبل کا انحصار ہے اور صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ غیر مسلم بھی مجبور ہیں کہ سب سے پہلے اپنے ملک کے سیاسی مستقبل کی فکر کریں کیونکہ اسی پر ان کی فلاح کا مدار ہے، لہٰذا اس ملک میں جو لوگ بھی زندگی کے عملی مسائل سے دلچسپی و تعلق رکھتے ہیں وہ تو تمہاری طرف توجہ نہیں کر سکتے البتہ کچھ گوشہ نشین و زاویہ پسند لوگ جو مذہبی ذہنیت رکھتے ہوں تمہیں ضرور مل جائیں گے"۔ یہ اعتراض دراصل اس سطح بینی کا نتیجہ ہے جس سے ہمارے آجکل کے سیاست کار حضرات معاملات کو دیکھنے اور سمجھنے میں کام لے رہے ہیں۔ یہ لوگ محض سیاسی اشکال اور صورتوں کے ردوبدل کو دیکھتے ہیں اور انہی میں اپنے مسائل کا حل تلاش کرتے ہیں لیکن سیاست کی عمارت جن بنیادوں پر قائم ہوتی ہے ان تک ان کی نگاہ نہیں پہنچتی۔ آپ کے موجودہ سیاسی مسائل جن کی فکر میں آپ لوگ آجکل الجھے ہوئے ہیں کس چیز کے پیدا کردہ ہیں؟ صرف اس بات کے کہ جن اخلاقی، اعتقادی و فکری اور تہذیبی و تمدنی بنیادوں پر اس ملک کی سوسائٹی قائم تھی وہ اتنی کمزور ثابت ہوئیں کہ ایک دوسری قوم اگرچہ وہ نہایت ہی گمراہ اور نہایت ہی غلط کار تھی مگر بہرحال اپنے اخلاقی اوصاف، اپنی تہذیبی و تمدنی طاقت اور اپنی عملی قابلیتوں کے لحاظ سے وہ آپ سے اتنی زیادہ برتر ثابت ہوئی کہ ہزاروں میل دور سے آکر اس نے آپ کو اپنا محکوم بنا لیا۔ پھر آپ اپنی مدت ہائے دراز کی غفلتوں اور کمزوریوں کی وجہ سے اس حد تک گر گئے کہ خود اس محکومی کے اندر بھی آپ کی ہمسایہ قومیں آپ کے مقابلے میں زیادہ طاقتور ہو گئیں اور آپ کے لیے یہ سوال پیدا ہو گیا کہ اپنے آپ کو کس کس سے بچائیں، گھر والے سے یا باہر والے سے؟ یہ ہے آپ کی تمام موجودہ سیاسی مسائل کا خلاصہ۔ اور ان مسائل کو آپ بھی اور آپ کی ہمسایہ دوسری ہندوستانی قومیں بھی صرف اس طرح حل کرنا چاہتی ہیں کہ ملک کا سیاسی نظام جس شکل پر قائم ہے اس میں بس کچھ اوپری ردوبدل ہو جائے۔ میں اس سیاست کو اور اس سیاسی طریق کار کو بالکل مہمل سمجھتا ہوں اور اس میں اپنا وقت ضائع کرنے کا کچھ حاصل نہیں پاتا۔ پھر صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ ساری دنیا میں جو سیاسی مسائل اس وقت درپیش ہیں ان کا خلاصہ بھی میرے نزدیک صرف یہ ہے کہ انسان کو جو حیثیت دنیا میں فی الواقع حاصل نہیں تھی اسے خواہ مخواہ اپنی حیثیت بنا لینے پر اس نے اصرار کیا اور اپنے اخلاق، اپنی تہذیب، اپنے تمدن، اپنی معیشت اور اپنی سیاست کی بنیاد خدا سے خود مختاری پر رکھ دی جس کا انجام آج ایک عظیم الشان فساد اور ایک زبردست طوفان فسق و فجور کی شکل میں رونما ہو رہا ہے۔ اس انجام کو انتظام دنیا کی محض ظاہری شکلوں کے ردوبدل سے دور کرنے کے لیے جو کوششیں آج کی جا رہی ہیں انہی کا نام آج "سیاست" ہے، اور میرے نزدیک بلکہ فی الحقیقت اسلام کے نزدیک یہ ساری سیاست سراسر لغو اور بے حاصل ہے۔ میں نے اسلام سے جن حقیقتوں کو سمجھا ہے ان کی بنا پر میرے نزدیک ہندوستان کے مسلمانوں کی اور ہندوستان کے سارے باشندوں کی اور تمام دنیا کے مسلمین اور دنیا کے غیر مسلمین کی سیاست کا حل صرف یہ ہے کہ ہم سب خدا کی بندگی اختیار کریں، اس کے قانون کو اپنا قانون حیات تسلیم کریں اور انتظام دنیا کی زمام اختیار فساق و فجار کے بجائے عباد اللہ الصالحین کے ہاتھ میں ہو۔ یہ سیاست اگر آپ کو اپیل نہیں کرتی اور آپ کچھ دوسری سیاست بازیوں سے اپنے مسائل کو حل کرنا چاہتے ہیں تو آپ کا راستہ الگ ہے اور میرا راستہ الگ۔ جائیے اور جن جن طریقوں سے اپنے مسائل کو حل کرنا چاہتے ہیں حل کر کے دیکھ لیجیے۔ مگر میں اور میرے رفقا علی وجہ البصیرت جس چیز میں

اپنی، اپنی قوم کی، اپنے ملک کی اور ساری دنیا کی فلاح دیکھتے ہیں، اسی پر ہم اپنی ساری کوششیں صرف کرتے رہیں گے۔ اگر دنیا کے لوگ ہماری باتوں کی طرف توجہ کریں گے تو ان کے اپنے لیے بھلا ہے، اور نہ کریں گے تو اپنا کچھ بگاڑیں گے ہمارا کچھ نقصان نہ کر سکیں گے۔

رہی یہ غلط فہمی کہ ہم زاہدوں اور گوشہ نشینوں کا ایک گروہ بنا رہے ہیں تو اگر یہ واقعہ کی غلط تعبیر نہیں ہے اور واقعی غلط فہمی ہی ہے تو اسے ہم صاف صاف رفع کر دینا چاہتے ہیں۔ ہم دراصل ایک ایسا گروہ تیار کرنا چاہتے ہیں جو ایک طرف زہد و تقویٰ میں اصطلاحی زاہدوں اور متقیوں سے بڑھ کر ہو اور دوسری طرف دنیا کے انتظام کو چلانے کی قابلیت و صلاحیت بھی عام دنیاداروں سے زیادہ اور بہتر رکھتا ہو۔ ہمارے نزدیک دنیا کی تمام خرابیوں کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ نیک لوگ نیکی کے صحیح مفہوم سے ناآشنا ہونے کی بنا پر گوشہ گیر ہو کر بیٹھ جاتے ہیں اور پرہیزگاری اسی کو سمجھتے ہیں کہ دنیا کے معاملات ہی سے پرہیز کریں، اور دوسری طرف ساری دنیا کے کاروبار بدوں کے ہاتھ میں آجاتے ہیں جن کی زبان پر نیکی کا نام اگر کبھی آتا بھی ہے تو صرف خلق خدا کو دھوکا دینے کے لیے۔ اس خرابی کا علاج صرف یہی ہو سکتا ہے کہ صالحین کی ایک جماعت منظم کی جائے جو خدا ترس بھی ہو، راست باز اور دیانت دار بھی ہو، خدا کے پسندیدہ اخلاق و اوصاف سے آراستہ بھی ہو اور اس کے ساتھ دنیا کے معاملات کو دنیاداروں سے زیادہ اچھی طرح سمجھے اور خود دنیاداری ہی میں اپنی مہارت و قابلیت سے ان کو شکست دے سکے۔ ہمارے نزدیک اس سے بڑا اور کوئی سیاسی کام نہیں ہو سکتا اور نہ اس سے زیادہ کامیاب سیاسی تحریک اور کوئی ہو سکتی ہے کہ ایسے ایک صالح گروہ کو منظم کر لیا جائے۔ بد اخلاق اور بے اصول لوگوں کے لیے دنیا کی چراگاہ میں بس اسی وقت تک چرنے چگنے کی مہلت ہے جب تک ایسا گروہ تیار نہیں ہو جاتا، اور جب ایسا گروہ تیار ہو جائے گا تو آپ یقین رکھیے کہ نہ صرف آپ کے اس ملک کی بلکہ بتدریج ساری دنیا کی سیاست اور معیشت اور مالیات اور علوم و آداب اور عدل و انصاف کی باگیں اسی گروہ کے ہاتھ میں آجائیں گی اور فساق و فجار کا چراغ ان کے آگے نہ جل سکے گا۔ یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ انقلاب کس طرح رونما ہوگا لیکن جتنا مجھے کل سورج کے طلوع ہونے کا یقین ہے اتنا ہی مجھے اس بات کا بھی یقین ہے کہ یہ انقلاب بہرحال رونما ہو کر رہے گا بشرطیکہ ہمیں صالحین کے ایسے گروہ کو منظم کرنے میں کامیابی حاصل ہو جائے۔

رفقائے جماعت سے خطاب

اب میں آپ لوگوں سے اجازت چاہوں گا کہ تھوڑی دیر کے لیے عام خطاب کو چھوڑ کر خاص طور پر کچھ باتیں اپنے رفقاء سے عرض کروں:

رفقائے محترم! سب سے پہلے آپ سے خطاب کرتے ہوئے میں اسی بات کو دہرانا ضروری سمجھتا ہوں جسے ہمیشہ ہر اجتماع کے موقع پر دہراتا رہا ہوں کہ اپنی اس عظیم الشان ذمہ داری کو محسوس کیجیے جس کو آپ نے شعوری طور پر اپنے خدا سے عہد و میثاق مضبوط کر کے اپنے اوپر خود عائد کر لیا ہے۔ آپ کے اس عہد کا تقاضا صرف یہی نہیں ہے کہ آپ قانون الٰہی کے زیادہ سے زیادہ پابند ہوں، اور آپ کے عقیدے اور قول و عمل میں کامل مطابقت ہو اور آپ کی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہ رہ جائے جس میں آپ کے افکار و اعمال اُس اسلام سے مختلف ہوں جس پر آپ ایمان لائے ہیں، بلکہ اس کے ساتھ آپ کے اسی عہد کا تقاضا اور نہایت شدید تقاضا یہ بھی ہے کہ جس اسلام پر آپ ایمان لائے ہیں اور جسے آپ اپنے بادشاہ کا دین سمجھتے ہیں اور جسے آپ تمام نوع انسانی کے لیے حق جانتے ہیں اور واحد ذریعہ فلاح بھی سمجھتے ہیں اس کو تمام دوسرے دینوں اور مسلکوں اور نظاموں کے مقابلے میں سربلند کرنے کے لیے، اور نوع انسانی کو ادیان باطلہ کی فساد انگیز تباہ کاریوں سے بچا کر دین حق کی سعادتوں سے بہرہ ور کرنے کے لیے آپ میں کم از کم اتنی بے چینی پائی جائے جتنی آج ادیان باطلہ کے پیرو

اپنے اپنے جھوٹے اور غارتگر دینوں کی حمایت و برتری کیلیے دکھا رہے ہیں۔ آپ کی آنکھوں کے سامنے اُن لوگوں کی مثالیں موجود ہیں جو سخت سے سخت خطرات، شدید سے شدید نقصانات، جان و مال کے زیاں، ملکوں کی تباہی اور اپنی اور اپنی اولاد اور اپنے عزیزوں اور جگر گوشوں کی قربانی صرف اس لیے گوارا کر رہے ہیں کہ جس طریقِ زندگی کو وہ صحیح سمجھتے ہیں اور جس نظام میں اپنے لیے فلاح کا امکان انھیں نظر آتا ہے اسے نہ صرف اپنے ملک پر بلکہ ساری دنیا پر غالب کرکے چھوڑیں۔ ان کے صبر اور ان کی قربانیوں اور محنتوں اور ان کے تحمل مصائب اور اپنے مقصد کے ساتھ اُن کے عشق کا موازنہ آپ اپنے عمل سے کرکے دیکھیے اور محسوس کیجیے کہ آپ اس معاملے میں ان کے ساتھ کیا نسبت رکھتے ہیں۔ اگر فی الواقع آپ کبھی ان کے مقابلے میں کامیاب ہو سکتے ہیں تو صرف اُسی وقت جبکہ ان حیثیات میں آپ ان سے بڑھ جائیں، ورنہ آپ کے مالی ایثار، آپ کے وقت اور محنت کے ایثار، اور اپنے مقصد کے ساتھ آپ کی محبت اور اس کے لیے آپ کی قربانی کا جو حال اس وقت ہے اس کو دیکھتے ہوئے تو آپ یہ حق بھی نہیں رکھتے کہ اپنے دل میں اس تمنا کو پرورش کریں کہ آپ کے ہاتھوں یہ جھنڈا کبھی بلند ہو۔

دوسری چیز جس کی طرف مجھے آپ کو توجہ دلانے کی بار بار ضرورت محسوس ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ آپ لوگ دین کے اصولی اور بنیادی امور کی اہمیت کو سمجھیں اور فروع کے ساتھ جو اہتمام اب تک کرتے رہے ہیں اور جس اہتمام کی بیماری آپکے سارے مذہبی ماحول کو لگی ہوئی ہے اس سے بچنے کی کوشش کریں۔ میں دیکھتا ہوں کہ میری اور جماعت کے چند دوسرے صاحب علم و نظر رفقاء کی کوششوں کے باوجود ہماری جماعت میں ابھی تک ان جزئیات کے ساتھ اچھا خاصہ انہماک بلکہ غلو پایا جاتا ہے جن پر ایک مدت سے فرقہ بندیاں اور گروہی کشمکشیں ہوتی رہی ہیں اور یہ کیفیت بسا اوقات اتنی بڑھ جاتی ہے کہ ہماری تفہیم سے اس طریقے کو چھوڑنے کے بجائے ہمارے بعض رفقاء الٹا ہمیں کو ان بحثوں میں الجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ خوب اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ جن جزئیات پر آپ لوگ بحثیں کرتے ہیں وہ خواہ کتنی ہی اہمیت رکھتی ہوں مگر بہرحال یہ وہ چیزیں نہیں ہیں جن کو قائم کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کو مبعوث کیا ہو اور اپنی کتابوں کو نازل کیا ہو۔ انبیا کی بعثت اور کتب الٰہی کی تنزیل کا مقصد ان جزئیات کو قائم کرنا نہیں ہے بلکہ دینِ حق کو قائم کرنا ہے۔ ان کا اصل مقصد یہ رہا ہے کہ خلق خدا اپنے مالک حقیقی کے سوا کسی کی تابع فرمان نہ رہے، قانون صرف خدا کا قانون ہو، تقویٰ صرف خدا سے ہو، امر صرف خدا کا مانا جائے، حق اور باطل کا فرق اور زندگی میں راہ راست کی ہدایت صرف وہی مسلّم ہو جسے خدا نے واضح کیا ہے، اور دنیا میں ان خرابیوں کا استیصال کیا جائے جو اللہ کو ناپسند ہیں اور ان خیرات و حسنات کو قائم کیا جائے جو اللہ کو محبوب ہیں۔ یہ ہے دین اور اسی کی اقامت ہمارا مقصد ہے اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے اسی کام پر ہم مامور ہیں۔ اس کام کی اہمیت اگر آپ پوری طرح محسوس کرلیں، اور اگر آپ کو اس بات کا بھی احساس ہو کہ اس کام کے معطل ہوجانے اور باطل نظاموں کے دنیا پر غالب ہوجانے سے دنیا کی موجودہ حالت کس قدر شدت سے غضب الٰہی کی مستحق ہوچکی ہے، اور اگر آپ یہ بھی جان لیں کہ اس حالت میں ہمارے لیے غضب الٰہی سے بچنے اور رضائے الٰہی سے سرفراز ہونے کی کوئی صورت اس کے سوا نہیں ہے کہ ہم اپنی تمام قوت خواہ وہ مال کی ہو یا جان کی، دماغ کی ہو یا زبان کی، صرف اقامت دین کی سعی میں صرف کردیں تو آپ سے کبھی ان فضول بحثوں اور ان لایعنی افکار کا صدور نہ ہو سکے جن میں اب تک آپ میں سے بہت سے لوگ مشغول ہیں۔ میرے نزدیک یہ تمام مشاغل صرف اس ایک چیز کا نتیجہ ہیں کہ لوگوں نے ابھی تک اس بات کو پوری طرح سمجھا نہیں ہے کہ دین حقیقت میں کس چیز کا نام ہے اور اس کے واقعی مطالبات اپنے پیروؤں سے کیا ہیں۔

ایک اور خامی جو ہمارے بعض رفقا میں پائی جاتی ہے اور جو اکثر ہمارے لیے سبب پریشانی بنتی رہتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ حضرات اصول اور مقصد اور نظریے کی حد تک تو اس جماعت کے مسلک کو سمجھ گئے ہیں لیکن طریق کار کو اچھی طرح نہیں سمجھے، اس لیے بار بار ان کی توجہات دوسری مختلف جماعتوں کے طریقوں کی طرف پھر جاتی ہیں اور وہ کسی نہ کسی طرح کھینچ تان کر کے بطور خود ہمارے نصب العین اور دوسروں کے طریق کار کی ایک معجونِ مرکب بنانے کی کوشش کرتے ہیں اور جب انھیں اس سے روکا جاتا ہے تو وہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ہم خواہ مخواہ ایک اچھے چلتے ہوئے زود اثر طریق کار کو محض اس تعصب کی بنا پر اختیار نہیں کرنا چاہتے کہ وہ ہمارا نہیں بلکہ دوسروں کا ایجاد کردہ طریقہ ہے۔ بعض حضرات نے تو ستم ہی کر دیا کہ جب ہماری طرف سے ان کو ٹوکا گیا تو انھوں نے ہمیں یہ اطمینان دلانے کی کوشش کی کہ نام آپ ہی کا لیا جائے گا دوسروں کا نہ لیا جائے گا۔ گویا ان کے نزدیک ہماری ساری تگ و دو صرف اپنا رجسٹرڈ ٹریڈ مارک چلانے کے لیے ہے، اور لطف یہ ہے کہ یہ سمجھتے ہوئے بھی وہ ہمارے ساتھ اس جماعت میں شریک ہیں۔ ہماری جماعت کی بعض مقامی شاخیں اس وبا سے خاص طور پر بہت زیادہ متاثر ہوئی ہیں، لیکن جہاں تاثر اتنا زیادہ نہیں ہے وہاں بھی مختلف طریقوں سے اس بات کا اظہار ہوتا رہتا ہے کہ کوئی تیز رفتار طریق کار اختیار کر کے جلدی سے کچھ چلتا پھرتا کام دنیا کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ یہ سب عمل بلا فکر کی اس پرانی بیماری کے نتائج ہیں جو مسلمانوں میں بہت دنوں سے پرورش پا رہی ہے اور فکر بلا عمل سے کچھ کم خطرناک نہیں ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر ان مذہبی اور سیاسی تحریکوں میں سے کسی میں بھی فی الواقع کوئی جان ہوتی جو اس وقت مسلمانوں میں چل رہی ہیں تو شاید ہم اس جماعت کی تاسیس میں ابھی کچھ تامل سے کام لیتے اور اپنی پوری قوت ان نسخوں کو آزما لینے میں صرف کر دیتے۔ مگر جو تھوڑی بہت نظر و بصیرت اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا کی ہے اس کی بنا پر ہم خوب اچھی طرح یہ سمجھ چکے ہیں کہ وقت کی چلتی ہوئی تحریکوں اور ان کی قیادتوں میں سے ایک بھی مسلمانوں کے مرض کا صحیح علاج نہیں ہے، اور نہ اسلام کے اصل منشا کو پورا کرنے والی ہے۔ محض جزوی طور پر مسلمانوں کے امراض کی ناکافی اور سطحی تشخیص کی گئی ہے اور اسلام کے اصل تقاضوں کا بھی صحیح طور پر ادراک نہیں کیا گیا ہے۔ پھر یہ بھی اچھی طرح نہیں سمجھا گیا کہ کفر و فسق کا یہ غلبہ اور دین کی یہ بے بسی اور مغلوبی جو آج موجود ہے فی الحقیقت کن اسباب کا نتیجہ ہے اور اب اس حالت کو بدلنے کے لیے کس ترتیب و تدریج سے کن کن میدانوں میں کیا کیا کام کرنا ہے۔ ان سب چیزوں کو سوچے اور سمجھے بغیر جو ملی اور حزبی تحریکیں جاری کی گئیں اور ان کو چلانے کے لیے جو زود اثر اور فی الفور نتیجہ منظر عام پر لے آنے والے طریقے اختیار کیے گئے وہ سب ہمارے نزدیک چاہے غلط نہ ہوں، چاہے ان کی مذمت ہم نہ کریں، اور چاہے ان کی اور ان کے پیچھے کام کرنے والے اخلاص کی ہم دل سے قدر کریں مگر بہر حال ہم ان کو لاحاصل سمجھتے ہیں۔ ہمیں پوری طرح یقین ہے کہ اس قسم کی تحریکیں اگر صدیوں تک بھی پوری کامیابی اور ہنگامہ خیزی کے ساتھ چلتی رہیں تب بھی نظام زندگی میں کوئی حقیقی انقلاب رونما نہیں ہو سکتا۔ حقیقی انقلاب اگر کسی تحریک سے رونما ہو سکتا ہے تو وہ صرف ہماری یہ تحریک ہے اور اس کے لیے فطرتاً بھی ایک طریق کار ہے جو ہم نے خوب سوچ سمجھ کر اور اس دین کے مزاج اور اس کی تاریخ کا گہرا جائزہ لے کر اختیار کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارا طریق کار نہایت صبر آزما، سست رفتار ہے، جلدی سے کوئی محسوس نتیجہ اس سے رونما نہیں ہو سکتا اور اس میں برسوں تک لگاتار ایسی محنت کرنی پڑتی ہے جس کے اثرات اور جس کی عملی نمود کو بسا اوقات خود محنت کرنے والا بھی محسوس نہیں کر سکتا لیکن اس راہ میں کامیابی کا راستہ یہی ہے اور اس کے سوا کوئی دوسرا طریق کار اس مقصد کے لیے ممکن نہیں ہے۔ جن لوگوں کو ہمارے مسلک اور طریق کار یا ان دونوں میں سے کسی ایک پر بھی اطمینان حاصل نہ ہو ان کے لیے یہ راستہ تو کھلا ہوا ہے کہ جماعت سے باہر جا کر اپنی صوابدید سے جس طرح چاہیں کام

کریں لیکن یہ اختیار انھیں کسی طرح نہیں دیا جا سکتا کہ بطور خود وہ ان دونوں میں یا ان میں سے کسی ایک چیز میں جو ترمیم چاہیں کر لیں۔ ہمارے ساتھ جس کو چلنا ہے اسے پورے اطمینان کے ساتھ ہمارے مسلک اور طریق کار کو ٹھیک سمجھ کر چلنا چاہیے اور جو شخص کچھ بھی میلان دوسری تحریکوں اور جماعتوں کی طرف رکھتا ہو اسے پہلے ان راستوں کو آزما کر دیکھ لینا چاہیے پھر اگر اس کا ذہن اسی فیصلے پر پہنچے جس پر ہم پہنچے ہوئے ہیں تو وہ اطمینان قلب کے ساتھ ہمارے ساتھ آ جائے۔

سطحیت اور مظاہرہ پسندی اور جلد بازی کی جو کمزوری مسلمانوں میں بالعموم پیدا ہو گئی ہے اس کا ایک ثبوت مجھے حال میں یہ ملا ہے کہ عوام میں تعلیم بالغان کے ذریعے سے کام کرنے کا جو طریقہ چند ماہ پیشتر میں نے پیش کیا تھا اس نے تو بہت کم لوگوں کو اپیل کیا، مگر گروہ بنا بنا کر بستیوں میں گشت لگانے اور فوری نتیجہ دکھانے والے طریق کار کے لیے (خواہ اس کا اثر کتنا ہی ناپائیدار ہو) مختلف مقامات سے ہمارے رفقا کے تقاضے برابر چلے آ رہے ہیں اور کسی فہمائش پر بھی ان کا سلسلہ ٹوٹنے میں نہیں آتا۔ حالانکہ ایک طرف یہ طریق کار ہے کہ ایک سال یا اس سے زیادہ مدت تک ناخواندہ عوام میں سے چند آدمیوں کو پیہم تعلیم و تربیت دے کر خوب پختہ کر لیا جائے اور ان کے عقائد، اخلاق، اعمال، مقصد زندگی، معیار قدر و قیمت، ہر چیز کو پوری طرح بدل ڈالا جائے اور پھر ان کو اپنی جماعت کا مستقل کارکن بنا کر، مزدوروں، کسانوں اور دوسرے عامی طبقوں میں کام کرنے کے لیے استعمال کیا جائے اور دوسری طرف یہ طریق کار ہے کہ ایک قلیل مدت میں ہزارہا آدمیوں کو بیک وقت چند ابتدائی امور دین کی حد تک مخاطب کیا جائے اور فوری طور پر ان میں ایک حرکت پیدا کر کے چھوڑ دیا جائے چاہے دوسری چکر کے وقت پہلی حرکت کا کوئی اثر ڈھونڈے سے بھی نہ مل سکے۔ ان دونوں طریقوں میں سے جب میں دیکھتا ہوں کہ لوگ پختہ نتائج پیدا کرنے والے دیر طلب، محنت طلب اور صبر آزما طریقے کو سنتے ہیں اور اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتے اور دوسرے طریقے کی طرف بار بار دوڑ چلنے کی کوشش کرتے ہیں تو میرے سامنے مسلمانوں کی وہ کمزوریاں بالکل بے نقاب ہو جاتی ہیں جن کی وجہ سے اب تک وہ خام کاریوں ہی میں اپنی قوتیں اور محنتیں اور اپنے مال اور اوقات ضائع کرتے رہے ہیں۔ میں اس سلسلے میں زیادہ سے زیادہ اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ جب تک اس جماعت کی باگیں میرے ہاتھ میں ہیں میں اپنے رفقا کو صحیح اور حقیقی نتیجہ خیز کاموں ہی پر لگانے کی کوشش کروں گا اور بے حاصل کوششوں میں جانتے بوجھتے ان کو مشغول نہ ہونے دوں گا۔

اپنی تقریر کو ختم کرنے سے پہلے ایک آخری بات کی طرف میں آپ لوگوں کو توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں۔ ہمارے حلقۂ رفقا میں ایک اچھا خاصا گروہ ایسا پایا جاتا ہے جس نے تبلیغ و اصلاح کے کام میں تشدد اور سخت گیری کا رنگ اختیار کر لیا ہے۔ جو سوالات ان کی طرف سے اکثر میرے پاس آتے رہتے ہیں ان سے میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ ان کے اندر بگڑے ہوئے لوگوں کو سنوارنے کی بیتابی اتنی زیادہ نہیں ہے جتنی انھیں اپنے سے کاٹ پھینکنے کی بیتابی ہے۔ دینی حرارت نے ان میں ہمدردی اور خیر خواہی کا جذبہ اتنا نہیں ابھارا جتنا نفرت اور غصے کا جذبہ ابھار دیا ہے۔ اسی وجہ سے وہ اکثر یہ تو پوچھتے ہیں کہ جو لوگ ایسے اور ایسے ہیں ان سے ہم تعلقات کیوں نہ منقطع کر لیں اور ان کے ساتھ نمازیں کیوں پڑھیں اور ان کو کافر و مشرک کیوں نہ کہیں۔ لیکن یہ پوچھنے کا ان کو بہت کم خیال آتا ہے کہ ہم اپنے ان بھٹکے ہوئے بھائیوں کو سیدھی راہ پر کیسے لائیں، ان کی غفلت و بے خبری کو کس طرح دور کریں، ان کی کج روی کو راست روی سے کیسے بدلیں، اور ان کو نور ہدایت سے مستفید ہونے پر کیونکر آمادہ کریں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے اللہ کے فضل سے اور اپنی خوش قسمتی سے حق کو پا لیا ہے ان کے اندر اس وجدانِ حق نے شکر کے بجائے کبر کا جذبہ پیدا

کر دیا ہے اور اسی کا اظہار ان شکلوں میں ہو رہا ہے۔ خدا نہ کرے کہ میرا یہ گمان صحیح ہو لیکن میں صاف صاف اس لیے بیان کر رہا ہوں کہ ہمارے رفیقوں میں سے ہر شخص پوری خدا ترسی کے ساتھ اپنے نفس کا جائزہ لے کر تحقیق کرنے کی کوشش کرے کہ کہیں شیطان نے یہ رخنہ تو ان کو نہیں لگا دیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ بگڑی ہوئی سوسائٹی کے درمیان علم صحیح اور عمل صالح رکھنے والوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک وبائے عام میں مبتلا ہو جانے والی بستی کے درمیان چند تندرست لوگ موجود ہوں جو کچھ طب کا علم بھی رکھتے ہوں اور کچھ دواؤں کا ذخیرہ بھی ان کے پاس ہو۔ مجھے بتایئے کہ اس وبا زدہ بستی میں ایسے چند لوگوں کا حقیقی فرض کیا ہے؟ کیا یہ کہ مریضوں سے اور ان کو لگی ہوئی آلائشوں سے نفرت کریں یا انھیں اپنے سے دور بھگائیں اور انھیں چھوڑ کر نکل جانے کی کوشش کریں یا یہ کہ اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر ان کا علاج اور ان کی تیمارداری کرنے کی فکر کریں، اور اس سعی میں اگر کچھ نجاستیں ان کے جسم و لباس کو لگ بھی جائیں تو انھیں برداشت کرلیں۔ شاید میں پورے وثوق کے ساتھ یہ دعویٰ کر سکتا ہوں کہ اگر یہ لوگ پہلی صورت اختیار کریں تو خدا کے ہاں الٹے مجرم قرار پائیں گے اور ان کی اپنی تندرستی اور ان کا علم طب سے واقف ہونا اور ان کے پاس دواؤں کا ذخیرہ موجود ہونا نافع ہونے کے بجائے الٹا ان کے جرم کو اور زیادہ سخت بنا دے گا۔ اسی پر آپ قیاس کرلیں کہ جن لوگوں کو دینی تندرستی حاصل ہے اور جو دین کا علم اور اصلاح کے ذرائع بھی رکھتے ہیں ان کے لیے کونسا طریقہ رضائے الٰہی کے مطابق ہے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العٰلمین

اس تقریر کے بعد اجتماع کا اجلاس اول ختم ہوا اور نماز عصر سے نماز مغرب تک کا وقفہ دیا گیا۔

اجلاس دوم

(تاریخ مذکور، بعد نماز مغرب)

اس اجلاس میں صوبہ بہار کی رپورٹ سید محمد حسنین صاحب قیم جماعت صوبہ بہار نے، اور صوبہ سرحد کی رپورٹ تاج الملوک صاحب نے پیش کی۔ اس کے بعد امیر جماعت نے ان رپورٹوں پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا:-

(۱) جن مقامات سے ارکانِ جماعت اجتماع میں شریک ہونے کے لیے نہیں آئے اور انھوں نے کوئی عذر بھی پیش نہیں کیا ان کے متعلق یہ سمجھنا چاہیے کہ وہ بلا عذر نہیں آئے۔ ایسے ارکان سے مقامی جماعتوں کے امرا کو بازپرس کرنی چاہیے۔ اگر پہلے ان کا رویہ جماعت میں درست رہا ہے تو انھیں صرف تنبیہ کر دینی چاہیے تاکہ آئندہ ان سے یہ کمزوری سرزد نہ ہو اور اگر پہلے سے ان کا طرزِ عمل جماعت کے کاموں میں عدم دلچسپی کا رہا ہو تو ان سے صاف کہہ دینا چاہیے کہ وہ جماعت کی رکنیت سے الگ ہو جائیں۔ عذر کے لیے ہم نے "عذر شرعی" کی قید لگائی ہے اس کے لحاظ سے کاروبار کا حرج یا مالی نقصان کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اگر ہمارے رفقا اس وقت اتنی قربانی بھی نہیں کر سکتے تو آئندہ ان سے کیا توقع کی جاسکتی ہے۔ ہمارے رفقاء میں آخر متعدد ایسے لوگ بھی تو ہیں جو ملازم تھے اور انھیں چھٹی نہ مل سکی مگر وہ پھر بھی اجتماع میں شریک ہونے کے لیے آگئے اور اب وہ اس کے نتائج بھگتنے کے لیے تیار ہیں۔ ایسے ہی لوگ ہمارے نقطۂ نظر سے قابلِ اعتماد ہیں۔ جو ارکان جماعت محض کاروباری نقصان کے خطرے سے نہیں آئے ہیں ان سے صاف کہہ دینا چاہیے کہ اب آپ اپنے کاروبار ہی کی خدمت کرتے رہیں،

اس عظیم الشان نصب العین کی خدمت کا نام لینا آپ کے لیے کچھ موزوں نہیں ہے۔ البتہ جو ارکان جماعت مالی کمزوری کی وجہ سے نہیں آسکے ہیں ان کا عذر معقول ہے۔ مگر جو دوسرے ارکان ان کے مصارف برداشت کرنے کے قابل تھے اور انھیں اپنے بھائیوں کی مجبوری کا علم بھی تھا اور پھر بھی انھوں نے اپنے ان بھائیوں کو ساتھ لانے کی کوشش نہیں کی ان پر ایسے ارکانِ جماعت کی عدم شرکت کا ازروئے ضابطہ چاہے کوئی بار نہ ہو لیکن اخلاقی طور پر وہ اس کے ذمہ دار ہیں۔ ایسے حضرات کو اپنی اس تنگ دلی کو رفع کرنے کی فکر کرنی چاہیے ورنہ جن سے آج یہ تھوڑا تھوڑا مالی ایثار بھی برداشت نہیں ہو سکتا ان سے کل کسی بڑے ایثار کی کیا توقع کی جا سکتی ہے۔

(۲) جن حلقوں کے لیے قیم جماعت بنا دیے گئے ہیں ان کی جماعتیں اپنی رپورٹیں براہ راست مرکز کو بھیجنے کے بجائے اپنے حلقے کے قیم کو بھیجیں اور قیم جماعت پورے حلقے کی رپورٹ مرکز میں روانہ کریں۔

(۳) جہاں جہاں جماعتیں قائم ہیں وہاں کے ارکان اپنی زکوٰۃ مقامی بیت المال میں داخل کریں اور باقاعدہ حساب دیں کہ ان کا مال کس قدر تھا اور اس پر انھوں نے کتنی زکوٰۃ ادا کی۔ جماعتی بیت المال کی موجودگی میں لوگوں کو اپنی زکوٰۃ انفرادی طور پر نکال کر خرچ نہیں کرنی چاہیے۔ جو لوگ صاحب نصاب ہوں اور باقاعدہ زکوٰۃ ادا نہ کریں ان کی شرعی حیثیت وہی ہے جو نماز نہ پڑھنے والوں کی ہے اور ایسے لوگ ہماری جماعت میں نہیں رہ سکتے۔

(۴) جن حضرات نے بعض علماء سے اپنی گفتگوؤں کا ذکر کیا ہے انھیں اپنی اس ہدایت کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں جو میں نے تشکیل جماعت کے آغاز میں دی تھی اور روداد اجتماع اول میں اسے پھر دیکھا جا سکتا ہے۔ میں نے اس میں کہا تھا کہ ہر آدمی کو اسی حلقے میں جانا چاہیے جس حلقے کے لوگوں سے خطاب کرنے کی اس میں اہلیت ہو۔ خصوصیت کے ساتھ غیر عالم لوگوں کو علماء کے پاس جا کر اپنی دعوت پیش کرنے میں تو بہت زیادہ احتیاط کرنی چاہیے کیونکہ ان حضرات کے مسائل بہت پیچیدہ اور نازک ہیں، اور نفس ہر وقت ان کے پاس حاضر رہتا ہے۔ ان کے نفسیات کچھ وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو دین میں گہری بصیرت رکھنے کے ساتھ ان کے "دینیات" سے بھی واقف ہیں۔ ان کو راہ حق کی طرف دعوت دینا نئے تعلیم یافتہ لوگوں کے بس کی بات نہیں ہے۔ وہ ان کے پاس جائیں گے تو کچھ کام بنانے کے بجائے اُلٹا کوئی خطرہ مول لے آئیں گے

(۵) آج کی رپورٹ میں یہ بیان کیا گیا ہے اور اس سے پہلے بھی یہ اعتراض میں اکثر سنتا رہا ہوں کہ بعض حلقوں میں جب ہماری دعوت پہنچتی ہے تو اس کا جواب یہ کہہ کر دیا جاتا ہے کہ "تمھاری تحریک میں کوئی نہ کوئی چیز مشتبہ ضرور ہے ورنہ کیسے ممکن تھا کہ تم یہ دعوت دیتے اور فلاں طاقت اسے ٹھنڈے دل سے برداشت کر لیتی"۔ دراصل اس قسم کی باتیں وہ لوگ کرتے ہیں جن کے اندر خود حق و باطل کی کوئی تمیز نہیں ہے اور انھوں نے صرف کسی دشمن طاقت کو حق کے پہچانے کا کام سپرد کر دیا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جس چیز پر دشمن بھڑکے وہ حق ہے اور جس چیز کو وہ برداشت کرلے وہ باطل ہے۔ اس معیار حق و باطل پر جو لوگ تکیہ کیے بیٹھے ہیں ہمیں یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ ان میں ایک اچھا خاصا گروہ علماء دین کا بھی ہے۔ ہم ان سے عرض کرتے ہیں کہ اگر فی الواقع آپ کے پاس دین کا علم موجود ہے تو سب سے پہلے قرآن و حدیث کے معیار سے پرکھ کر یہ دیکھیے کہ جس چیز کی دعوت ہم دے رہے ہیں وہ بجائے خود حق ہے یا نہیں۔ اس کے بعد پھر اس امر پہ غور کیجیے کہ اگر یہ حق ہے تو آخر بات کیا ہے کہ شیطان اور اولیائے شیطان

اسے برداشت کرنے لگے ہیں؟ کیا حق کی فطرت بدل گئی ہے یا شیطان اب وہ نہیں رہا ہے جو پہلے تھا؟ اس پہلو پر جب آپ غور کریں گے تو آپ پر خود یہ بات منکشف ہو جائے گی کہ اتنا بڑا انقلاب، یعنی توحید خالص کی دعوت کا شیطان کے لیے قابل برداشت ہو جانا خود آپ حضرات کی اپنی غلطیوں کا نتیجہ ہے۔ آپ ہی نے تمام اُن الفاظ اور اصطلاحات کی جان نکال دی ہے جن کے ذریعے سے دین کی دعوت قرآن وسنت میں پیش کی گئی تھی۔ الٰہ، اور رب، دین، اور عبادت، شرک اور توحید، طاغوت اور فتنہ و فساد، معروف اور منکر، خیر اور صلاح غرض ایسے تمام الفاظ جو اسلام کی روح کو پیش کرنے کے لیے شریعت میں اختیار کیے گئے تھے آج آپ ہی حضرات کے تصرفات کی بدولت اتنے بے معنی ہو گئے ہیں کہ طاغوت کی چھاؤنیوں تک میں اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کا پانچ وقت اعلان ہوتا ہے اور وہاں اس سے ذرہ برابر بھی کوئی کھلبلی برپا نہیں ہوتی بلکہ خود طاغوت اپنے جاں نثاروں کے لیے امام اور موذن اور خطیب پورے اطمینان کے ساتھ مہیا کرتا ہے، اور اس کے سرفروش خادموں میں اگر پورے کا پورا قرآن بھی مفت تقسیم کیا جائے تو وہ اس سے کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتا۔ اس طرح دین کو شیطان کے لیے بالکل بے ضرر و بے خطر بنا چکنے کے بعد اب آپ لوگ دوسری خدمت یہ انجام دینا چاہتے ہیں کہ اگر دین کی وہی دعوت قرآن وسنت کی انہی اصل اصطلاحوں میں پیش کی جائے اور شیطان اور دنیا، شیطان اس پر نہ بھڑکیں تو آپ اسے اس بات کا ثبوت قرار دیتے ہیں کہ یہ دین کی دعوت ہی نہیں ہے یا یہ حق نہیں ہے۔ ہم اس وقت اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ اسلام کی ان تمام اصطلاحات میں پھر وہی معنی پیدا کریں جو فی الاصل ان کے اندر پنہاں تھے اور کلمۂ اسلام کے ماننے اور بولنے والے اسے اس کے پورے معنی کے ساتھ نہ صرف مانیں اور بولیں بلکہ اپنی پوری زندگی میں اسی شعور کا اظہار بھی کریں۔ ہماری اس کوشش کے پوری طرح بار آور ہونے میں ظاہر ہے کہ ابھی بہت دیر لگے گی اور جب تک یہ بار آور نہ ہو شیطان اور اس کے اولیا مطمئن رہیں گے اور دوسرے محاذوں پر اپنی قوت صرف کرتے رہیں گے۔ خصوصاً جبکہ انھیں یہ بھی اطمینان ہے کہ احیاء دین کی اس کوشش کو مٹانے کے لیے آپ حضرات کافی ہو سکتے ہیں تو پھر وہ خون شہیداں اپنی گردن پر کیوں لیں؟ البتہ اگر ہم اپنی اس سعی میں کامیاب ہو گئے اور آپ کے فتنوں سے بھی بخیریت بچ نکلے تو بعید نہیں کہ صورت حال اُس سے بھی زیادہ سخت ہو جتنا سخت آپ اسے دیکھنا چاہتے ہیں۔ مگر اندیشہ ہے، اور خدا کرے کہ ہمارا یہ اندیشہ غلط ہو، کہ آپ اس وقت بھی ہمارا ساتھ نہ دینے کے لیے اسی قسم کا کوئی بہانہ تلاش کر لیں گے جیسا کہ آج آپ نے تلاش کر لیا ہے۔

(۶) صوبہ سرحد کے ارکان نے اپنے راستے کی جن رکاوٹوں کا ذکر کیا ہے وہ بلاشبہ بہت وزنی رکاوٹیں ہیں اور ہر ایسے علاقے میں جہاں تعصب اور ضد اور شعلہ مزاجی کا زور ہو ایسی رکاوٹوں کا موجود ہونا فطری امر ہے لیکن میں اپنے رفقاء کو یہ اچھی طرح سمجھا دینا چاہتا ہوں کہ حکیمانہ تبلیغ، جبکہ وہ صبر اور حلم اور لگاتار محنتوں کے ساتھ ہو، وہ زبردست ہتھیار ہے جس سے مخالفتوں کے بڑے بڑے پہاڑ کٹ جاتے ہیں اور راستہ ہموار ہو جاتا ہے۔ جن لوگوں کو روسی ترکستان کے حالات کا علم ہے وہ جانتے ہیں کہ اب سے پچیس سال پہلے وہاں اسلام کے خلاف ذرا سی بھاپ بھی منہ سے نہیں نکالی جا سکتی تھی لیکن اشتراکیوں نے جس حکمت اور صبر کے ساتھ خود اپنے الحاد اور مادہ پرستانہ پروگرام کی تبلیغ کی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند سال ہی کے اندر اسلام کے اس پرانے قلعہ کی جڑیں ہل گئیں اور خود انہی مسلمانوں نے جو بظاہر اسلام میں بڑے پختہ تھے اشتراکی تبلیغ سے متاثر ہو کر اپنے

ہاتھوں سے اسلام کی بنیادیں ڈھادیں۔ اگر حکمت اور صبر کے ساتھ باطل یہ سب کچھ کرسکتا ہے درانحالیکہ وہ انسانی فطرت سے بعید تر ہے تو میں نہیں سمجھتا کہ حق کم از کم اتنا ہی کچھ کیوں نہیں کرسکتا جبکہ وہ فطرت انسانی سے قریب تر ہے۔ پس حالات اس وقت خواہ کتنے ہی مخالف ہوں ان سے ہمت نہ ہاریئے، کتاب و سنت سے اور دنیا کے تجربات سے تبلیغ کی حکمت سیکھیے اور وہ اوصاف اپنے اندر پیدا کیجیے جن سے بنجر زمینوں کو بارآوری کے لیے تیار کیا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ خدا کے فضل سے ساری رکاوٹیں دور ہوکر رہیں گی۔

نوٹ:۔ صوبہ سرحد میں اس وقت تک باقاعدہ جماعت نہیں بنی تھی منتشر ارکان تھے۔ مگر اس اجلاس کے بعد امیر جماعت کی ہدایت کے مطابق باقاعدہ جماعت کی تشکیل کردی گئی اور جناب سردار علی خاں صاحب (موضع سیر، ڈاکخانہ تخت بائی ضلع پشاور) اس صوبے کے لیے قیم مقرر کیے گئے۔

اجلاس سوم

(۷ رجمادی الاول ۱۳۶۳ھ بروز جمعہ۔ ۹ بجے صبح)

یہ اجلاس ٹھیک وقت پر مسجد میں شروع ہوا۔ سب سے پہلے چوہدری غلام محمد صاحب نے صوبہ سندھ کے حالات اجمالاً بیان کیے اور اُن اسباب کو بھی مختصراً پیش کیا جن کی وجہ سے اب تک سندھ ہماری تحریک سے غیر متاثر رہا ہے۔ اس کے بعد جے۔ بشیر احمد صاحب نے بمبئی کی رپورٹ پڑھ کر سنائی۔ پھر ریاست حیدرآباد کے مختلف مقامات کی رپورٹیں پیش ہوئیں۔ اس کے بعد صوبہ مدراس اور مالابار اور میسور کی رپورٹیں پڑھی گئیں۔ آخر میں امیر جماعت نے ان رپورٹوں پر حسب ذیل تبصرہ کیا:۔

(۱) رات سے اب تک جو رپورٹیں پیش ہوئی ہیں ان کو سننے سے یہ اندازہ ہوا کہ ہمارے رفقاء جماعت اپنی رپورٹیں مرتب کرنے میں غیر ضروری تفصیلات شامل کردیتے ہیں اور ضروری تفصیلات بسا اوقات چھوڑ جاتے ہیں۔ اس طریقے کی اصلاح ہونی چاہیے۔ رپورٹوں میں ایسی چیزیں نہیں آنی چاہئیں جو محض مقامی حیثیت رکھتی ہوں اور جن کے بیان کرنے یا نہ کرنے کا اصل معاملات کو سمجھنے میں کوئی دخل نہ ہو۔ اسی طرح رپورٹوں میں اشخاص اور جماعتوں کے نام بھی کم سے کم آنے چاہئیں، نہ شکایت کے پہلو سے اور نہ تعریف کے پہلو سے۔ مرکز کو جو رپورٹیں بھیجی جاتی ہیں ان میں تو ایسی چیزیں آنے کا مضائقہ نہیں ہے لیکن اجتماع میں پیش کرنے کے لیے جو روداد یں مرتب کی جائیں ان کو ایسی چیزوں سے خالی رہنا چاہیے۔ دراصل جس غرض کے لیے ہم اجتماع میں روداد میں پیش کرتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ ہمارے ارکان کو یہ معلوم ہو کہ مختلف علاقوں میں تحریک کس رفتار سے چل رہی ہے، کہاں کہاں کس کس قسم کی رکاوٹیں پیش آرہی ہیں، مختلف مقامات کے ارکان کن کن طریقوں سے کام کر رہے ہیں کن کن حلقوں میں ہمارے خیالات پھیل رہے ہیں اور کہاں حالات امید افزا یا مایوس کن ہیں۔

(۲) جہاں ہماری مقامی جماعتوں یا انفرادی طور پر ہمارے کسی مقامی رکن نے دارالمطالعہ قائم کیا ہو وہاں انھیں لوگوں کو صرف کتابیں دینے پر ہی اکتفا نہ کرنا چاہیے بلکہ اس امر پر بھی نگاہ رکھنی چاہیے کہ کون لوگ کیا پڑھتے ہیں اور کس حد تک دلچسپی لیتے ہیں۔ پھر ان لوگوں سے شخصی طور پر ملنے اور تبادلہ خیال کرنے کی بھی کوشش کرنی چاہیے تاکہ انھیں بتدریج اپنے نقطۂ نظر سے قریب

لایا جائے۔ اگر ان کے کچھ شکوک ہوں تو وہ رفع کیے جائیں اور یہ اندازہ ہوتا رہے کہ کس قسم کے لوگ کس کس حد تک ہمارے خیالات سے متاثر ہیں اور ان کی ہمدردی اور ہم خیالی سے کہاں تک فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ دار المطالعہ قائم کرنا تو بالکل ایسا ہے جیسے تخم ریزی کرنا، لیکن آپ ہوا کی طرح صرف بیج پھیلانے ہی پر اکتفا نہ کریں بلکہ کسان کی سی حیثیت اختیار کریں۔ جو زمین میں بیج ڈالنے کے بعد پیہم اس کو سینچتا اور اس کی نگہداشت کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ کھیتی پک کر تیار ہو جائے۔

(۳) مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بعض مقامی جماعتوں میں امارت کے انتخاب میں کچھ انجمنوں کی صدارت کا سا رنگ اختیار کر لیا گیا ہے۔ یہ منصب دراصل مقامی لیڈرشپ کا منصب ہے۔ جو شخص جماعت میں اہل ترین نظر آئے اسی کو منتخب کرنا چاہیے مگر کسی کے سر زبردستی اس منصب کو چپکنا نہ چاہیے۔ اسی طرح جس شخص کو اپنے اندر اس منصب کے سنبھالنے کی اہلیت نظر آئے یا یہ محسوس ہو کہ کوئی اتنی اہلیت بھی نہیں رکھتا جتنی اس کے اندر ہے تو اسے خواہ مخواہ انکسار کر کے ذمہ داری سنبھالنے سے انکار بھی نہیں کرنا چاہیے۔ یہ کام بہرحال کرنے کا ہے اور ہم میں سے ہر ایک میں یہ جذبہ ہونا چاہیے کہ اگر کوئی اس کی ذمہ داری سنبھالنے کے لیے نہیں اٹھتا تو اسے اٹھنا ہے۔

(۴) سندھ کے حالات پر غور کرنے سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جب تک سندھی زبان میں کافی لٹریچر تیار نہ ہو جائے ہمیں اردو زبان کے ذریعہ سے اس پنجابی عنصر کو جو سندھ میں آباد ہے یا ان تھوڑے سے اردو خواں سندھی لوگوں کو جو وہاں مل سکیں، متاثر کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، پھر ان کے ذریعے سے خالص سندھی بولنے والے لوگوں میں خیالات پھیلائے جا سکتے ہیں۔ سندھی پبلک کی جہالت اور ان کی قبائلی عصبیت نیز ان کے اندر پیر پرستی کا زور ہونا بلاشبہ بڑی رکاوٹیں ہیں لیکن ان چیزوں سے گھبرانا نہیں چاہیے۔ کام کرنے کا ڈھنگ آجانے اور حکمت تبلیغ سیکھ لینے کے بعد اگر آپ صبر، تحمل اور لگاتار محنت کے ساتھ کام کریں گے تو آپ خود دیکھ لیں گے کہ یہ رکاوٹیں دور ہوتی چلی جائیں گی اور یہی پبلک جو آج آپ کی بات سننے کے لیے تیار نہیں ہے خود ان رکاوٹوں کو راستے سے ہٹانے میں آپ کی مددگار بن جائے گی۔

(۵) لوگوں سے اپنے کاموں میں مالی اعانتیں ہم کس حالت میں قبول کر سکتے ہیں؟ اس باب میں جماعت کی پالیسی کو میں پھر بیان کر دینا چاہتا ہوں کیونکہ بعض رپورٹوں سے یہ اندازہ ہوا کہ ہمارے ارکانِ جماعت ابھی اس پالیسی کو اچھی طرح نہیں سمجھے ہیں۔ ہم مالی اعانت صرف ان لوگوں سے قبول کر سکتے ہیں جو اول تو ہمارے مقصد سے اچھی طرح واقف ہوں اور اس کے ساتھ پوری ہمدردی رکھتے ہوں۔ دوسرے ان کو ہمارے طریق کار سے پورا اتفاق ہو اور ہم پر بحیثیت اشخاص اور بحیثیت جماعت اعتماد ہو۔ تیسرے یہ کہ وہ روپیہ یا کسی شکل میں مال دینے کے بعد کسی قسم کی کوئی شرط ہم پر عائد نہ کریں نہ اپنے روپے کے ذریعے سے ہمارے کام میں کسی قسم کی مداخلت کی کوشش کریں، اور نہ ہماری اسکیم سے باہر کا کوئی کام ہمارے لیے تجویز کریں کہ وہ ان کے روپے سے کیا جائے۔ البتہ ہمارے اپنے زیرِ تجویز کاموں میں سے کسی کے متعلق وہ اس خواہش کا اظہار کر سکتے ہیں کہ ان کا روپیہ فلاں کام میں صرف ہو۔ چوتھے یہ کہ ان کے اندر اس قسم کی کوئی خواہش نہ پائی جائے کہ ان کے نام کی شہرت ہو یا ہمارا کوئی کام ان کے نام سے منسوب ہو، یا شخصی طور پر ہم میں سے کوئی ان کا شکر گزار ہو یا جماعتی طور پر ہم ان کے احسان مند ہوں۔ جس کو بھی ہمارے اس کام میں روپیہ دینا ہو وہ خالص خدا کے لیے دے، خدا ہی سے اجر کا امیدوار ہو اور اعلاء کلمۃ اللہ

کے سوا اور کسی چیز کو اپنے مالی ایثار کا صلہ نہ سمجھے۔ یہ ہماری مستقل پالیسی ہے اور اس میں ہم کسی بڑے سے بڑے انسان کی خاطر یا کسی بڑی سے بڑی رقم کی خاطر بھی کوئی ترمیم نہیں کر سکتے۔

(۶) جو تعلیمی، تبلیغی، اصلاحی یا کسی اور قسم کے ادارے ملک میں قائم ہیں یا آئندہ قائم ہوں ان کے متعلق بھی میں جماعت کی پالیسی کی تشریح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں، کیونکہ اس معاملے میں بھی مجھے بعض ارکانِ جماعت کا طرزِ عمل قابلِ اصلاح نظر آیا ہے۔ اس قسم کے ادارے اگر بالکلیہ ہماری جماعت کے حوالے کر دیے جائیں اور ہماری پالیسی کے مطابق چل سکیں حتیٰ کہ اگر ہم ان کو غیر ضروری سمجھ کر یا غیر مفید پا کر توڑنا چاہیں تو توڑ بھی سکیں تب تو ہماری جماعت کا کوئی رکن ان کے چلانے کی ذمہ داری اپنے ہاتھ میں لے سکتا ہے لیکن اگر یہ صورت نہ ہو تو کسی رکن جماعت کو ان کے چلانے کی ذمہ داری قبول نہ کرنی چاہیے۔ وہ اگر معاشی حیثیت سے مجبور ہو تو اس قسم کے کسی ادارے میں ملازم کی حیثیت سے کام کر سکتا ہے لیکن ان کا ذمہ دار کارکن نہیں بن سکتا کیونکہ اس صورت میں وہ ادارہ خواہ مخواہ ہماری طرف منسوب ہوگا، اس کے کاموں کی جوابدہی جماعت پر عائد ہوگی اور ان اداروں کے چلانے میں جو نامناسب طریقے بالعموم اختیار کرنے پڑتے ہیں انھیں بادلِ نخواستہ ہمارے رکن جماعت کو بھی اختیار کرنا پڑے گا اور اس سے جماعت کی اخلاقی پوزیشن متاثر ہوگی۔

اس کے بعد اجلاس برخاست ہوا اور لوگ جمعہ اور کھانے کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔

خطبہ جمعہ

ٹھیک ڈیڑھ بجے جمعہ کی دوسری اذان ہوئی اور امیر جماعت نے بعد حمد و ثنا حسب ذیل خطبۂ جمعہ ارشاد فرمایا:۔

برادرانِ دین! اللہ تعالیٰ اپنی کتاب پاک میں فرماتا ہے:۔ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ۔ یعنی اے محمدؐ! کہو میری نماز اور میرے تمام مراسم عبودیت اور میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ اللہ کے لیے ہے جو ساری کائنات کا مالک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں اور اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور سب سے پہلے میں اس کی اطاعت میں سرِ تسلیم خم کرتا ہوں۔

اس آیت کی تشریح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے ہوتی ہے: من احب للّٰہ وابغض للّٰہ واعطی للّٰہ ومنع للّٰہ فقد استکمل الایمان، جس نے کسی سے دوستی و محبت کی تو خدا کے لیے کی اور دشمنی کی تو خدا کے لیے کی اور کسی کو دیا تو خدا کے لیے دیا اور کسی سے روکا تو خدا کے لیے روکا اس نے اپنے ایمان کو کامل کر لیا، یعنی وہ پورا مومن ہو گیا۔

پہلے جو آیت میں نے آپ کے سامنے پیش کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنی بندگی کو اور اپنے جینے اور مرنے کو صرف اللہ کے لیے خالص کر لے اور اللہ کے سوا کسی کو اس میں شریک نہ کرے یعنی نہ تو اس کی بندگی اللہ کے علاوہ کسی اور کے لیے ہو اور نہ اس کا جینا اور مرنا۔ اس کی جو تشریح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے میں نے آپ کو سنائی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کی محبت اور دشمنی اور اپنی دنیوی زندگی کے معاملات میں اس کا لین دین خالصۃً خدا کے لیے ہونا عین تقاضائے ایمان ہے۔ اس کے بغیر ایمان ہی کی تکمیل نہیں ہوتی کجا کہ مراتب عالیہ کا دروازہ کھل سکے۔ جتنی کمی اس معاملے میں ہوگی

اتنا ہی نقص آدمی کے ایمان میں ہوگا اور جب اس حیثیت سے آدمی مکمل طور پر خدا کا ہوجائے تب کہیں اس کا ایمان مکمل ہوتا ہے۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس قسم کی چیزیں صرف مراتب عالیہ کا دروازہ کھولتی ہیں ورنہ ایمان و اسلام کے لیے انسان کے اندر یہ کیفیت پیدا ہونا شرط نہیں ہے، یعنی بالفاظ دیگر اس کیفیت کے بغیر بھی انسان مومن و مسلم ہوسکتا ہے۔ مگر یہ ایک غلط فہمی ہے اور اس غلط فہمی کے پیدا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ عام طور پر لوگ فقہی اور قانونی اسلام اور اس حقیقی اسلام میں جو خدا کے ہاں معتبر ہے، فرق نہیں کرتے۔ فقہی اور قانونی اسلام میں آدمی کے قلب کا حال نہیں دیکھا جاتا اور نہیں دیکھا جاسکتا، بلکہ صرف اس کے اقرار زبانی کو اور اس امر کو دیکھا جاتا ہے کہ وہ اپنے اندر ان لازمی علامات کو نمایاں کرتا ہے یا نہیں جو اقرار زبانی کی توثیق کے لیے ضروری ہیں۔ اگر کسی شخص نے زبان سے اللہ اور رسول اور قرآن اور آخرت اور دوسرے ایمانیات کو ماننے کا اقرار کرلیا اور اس کے بعد وہ ضروری شرائط بھی پوری کردیں جن سے اُس کے ماننے کا ثبوت ملتا ہے تو وہ دائرہ اسلام میں لے لیا جائے گا اور سارے معاملات اس کے ساتھ مسلمان سمجھ کر کیے جائیں گے لیکن یہ چیز صرف دنیا کے لیے ہے اور دنیوی حیثیت سے وہ قانونی اور تمدنی بنیاد فراہم کرتی ہے جس پر مسلم سوسائٹی کی تعمیر کی گئی ہے۔ اس کا حاصل اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ایسے اقرار کے ساتھ جتنے لوگ مسلم سوسائٹی میں داخل ہوں ان کو ایک دوسرے پر شرعی اور قانونی اور اخلاقی اور معاشرتی حقوق حاصل ہوجائیں۔ ان کے درمیان شادی بیاہ کے تعلقات قائم ہوں، میراث تقسیم ہو اور دوسرے تمدنی روابط وجود میں آئیں۔ لیکن آخرت میں انسان کی نجات اور اس کا مسلم و مومن قرار دیا جانا اور اللہ کے مقبول بندوں میں شمار ہونا اس قانونی اقرار پر مبنی نہیں ہے، بلکہ وہاں اصل چیز آدمی کا قلبی اقرار، اس کے دل کا جھکاؤ اور اس کا برضا و رغبت اپنے آپ کو بالکلیہ خدا کے حوالے کردینا ہے۔ دنیا میں جو زبانی اقرار کیا جاتا ہے وہ تو صرف قاضی شرع کے لیے اور عام انسانوں اور مسلمانوں کے لیے ہے کیونکہ وہ صرف ظاہر ہی کو دیکھ سکتے ہیں، مگر اللہ آدمی کے دل کو اور اس کے باطن کو دیکھتا ہے اور اس کے ایمان کو ناپتا ہے۔ اس کے ہاں آدمی کو جس حیثیت سے جانچا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ آیا اس کا جینا اور مرنا اور اس کی وفاداریاں اور اس کی اطاعت و بندگی اور اس کا پورا کارنامہ زندگی اللہ کے لیے ہے یا کسی اور کے لیے۔ اگر اللہ کے لیے ہے تو وہ مسلم اور مومن ہے اور اگر کسی اور کے لیے ہے تو نہ مسلم ہے نہ مومن۔ اس حیثیت سے جو جتنا خام ہے اتنا ہی اس کا ایمان اور اسلام خام ہے خواہ دنیا میں اس کا شمار کیسے ہی بڑے مسلمانوں میں ہوتا ہو اور اس کو کتنے ہی بڑے مراتب دیے جاتے ہوں۔ اللہ کے ہاں قدر صرف اس چیز کی ہے کہ جو کچھ اس نے آپ کو دیا ہے وہ سب کچھ آپ نے اس کی راہ میں لگا دیا یا نہیں۔ اگر آپ نے ایسا کردیا تو آپ کو وہی حق دیا جائے گا جو وفاداروں کو اور حق بندگی ادا کرنے والوں کو دیا جاتا ہے، اور اگر آپ نے کسی چیز کو خدا کی بندگی سے مستثنیٰ کرکے رکھا تو آپ کا یہ اقرار کہ آپ مسلم ہوئے یعنی یہ کہ آپ نے اپنے آپ کو بالکل خدا کے حوالے کردیا محض ایک جھوٹا اقرار ہے جس سے دنیا کے لوگ دھوکا کھاسکتے ہیں، جس سے فریب کھاکر مسلم سوسائٹی آپ کو اپنے اندر جگہ دے سکتی ہے، جس سے دنیا میں آپ کو مسلمانوں کے سے تمام حقوق مل سکتے ہیں، لیکن اس سے فریب کھاکر خدا اپنے ہاں آپ کو وفاداروں میں جگہ نہیں دے سکتا۔

یہ قانونی اور حقیقی اسلام کا فرق جو میں نے آپ کے سامنے بیان کیا ہے اگر آپ اس پر غور کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس کے نتائج صرف آخرت ہی میں مختلف نہیں ہوں گے بلکہ دنیا میں بھی ایک بڑی حد تک مختلف ہیں۔ دنیا میں جو مسلمان

کے سوا اور کسی چیز کو اپنے مالی ایثار کا صلہ نہ سمجھے۔ یہ ہماری مستقل پالیسی ہے اور اس میں ہم کسی بڑے سے بڑے انسان کی خاطر یا کسی بڑی سے بڑی رقم کی خاطر بھی کوئی ترمیم نہیں کر سکتے۔

(۶) جو تعلیمی، تبلیغی، اصلاحی یا کسی اور قسم کے ادارے ملک میں قائم ہیں یا آئندہ قائم ہوں ان کے متعلق بھی میں جماعت کی پالیسی کی تشریح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں، کیونکہ اس معاملے میں بھی مجھے بعض ارکان جماعت کا طرزِ عمل قابلِ اصلاح نظر آیا ہے۔ اس قسم کے ادارے اگر بالکلیہ ہماری جماعت کے حوالے کر دیے جائیں اور ہماری پالیسی کے مطابق چل سکیں حتیٰ کہ اگر ہم ان کو غیر ضروری سمجھ کر یا غیر مفید پا کر توڑنا چاہیں تو توڑ بھی سکیں تب تو ہماری جماعت کا کوئی رکن ان کے چلانے کی ذمہ داری اپنے ہاتھ میں لے سکتا ہے لیکن اگر یہ صورت نہ ہو تو کسی رکن جماعت کو ان کے چلانے کی ذمہ داری قبول نہ کرنی چاہیے۔ وہ اگر معاشی حیثیت سے مجبور ہو تو اس قسم کے کسی ادارے میں ملازم کی حیثیت سے کام کر سکتا ہے لیکن ان کا ذمہ دار کارکن نہیں بن سکتا کیونکہ اس صورت میں وہ ادارہ خواہ مخواہ ہماری طرف منسوب ہوگا، اس کے کاموں کی جوابدہی جماعت پر عائد ہوگی اور ان اداروں کے چلانے میں جو نامناسب طریقے بالعموم اختیار کرنے پڑتے ہیں انھیں بادلِ نخواستہ ہمارے رکن جماعت کو بھی اختیار کرنا پڑے گا اور اس سے جماعت کی اخلاقی پوزیشن متاثر ہوگی۔

اس کے بعد اجلاس برخاست ہوا اور لوگ جمعہ اور کھانے کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔

خطبہ جمعہ

ٹھیک ڈیڑھ بجے جمعہ کی دوسری اذان ہوئی اور امیر جماعت نے بعد حمد و ثنا حسب ذیل خطبہ جمعہ ارشاد فرمایا:-

برادرانِ دین! اللہ تعالیٰ اپنی کتاب پاک میں فرماتا ہے:- قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ۔ یعنی اے محمدؐ! کہو میری نماز اور میرے تمام مراسمِ عبودیت اور میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ اللہ کے لیے ہے جو ساری کائنات کا مالک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں اور اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور سب سے پہلے میں اس کی اطاعت میں سرِ تسلیم خم کرتا ہوں۔

اس آیت کی تشریح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے ہوتی ہے۔ من احب للہ وابغض للہ واعطی للہ ومنع للہ فقد استکمل الایمان۔ جس نے کسی سے دوستی و محبت کی تو خدا کے لیے کی اور دشمنی کی تو خدا کے لیے کی اور کسی کو دیا تو خدا کے لیے دیا اور کسی سے روکا تو خدا کے لیے روکا اس نے اپنے ایمان کو کامل کر لیا۔ یعنی وہ پورا مومن ہو گیا۔

پہلے جو آیت میں نے آپ کے سامنے پیش کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنی بندگی کو اور اپنے جینے اور مرنے کو صرف اللہ کے لیے خالص کر لے اور اللہ کے سوا کسی کو اس میں شریک نہ کرے یعنی نہ تو اس کی بندگی اللہ کے علاوہ کسی اور کے لیے ہو اور نہ اس کا جینا اور مرنا۔ اس کی جو تشریح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے میں نے آپ کو سنائی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کی محبت اور دشمنی اور اپنی دنیوی زندگی کے معاملات میں اس کا لین دین خالصۃً خدا کے لیے ہونا عین تقاضائے ایمان ہے۔ اس کے بغیر ایمان ہی کی تکمیل نہیں ہوتی کجا کہ مراتبِ عالیہ کا دروازہ کھل سکے۔ جتنی کمی اس معاملے میں ہوگی

قائم ہو گئے۔ خدا کو ایسے مسلمان ہرگز مطلوب نہ تھے۔ اس نے اپنے انبیاء کو دنیا میں اس لیے نہیں بھیجا تھا، اپنی کتابیں اس لیے نازل کی تھیں کہ صرف اس طرز کے مسلمان دنیا میں بنا ڈالے جائیں۔ دنیا میں ایسے مسلمانوں کے کم ہونے سے کسی حقیقی قدر و قیمت رکھنے والی چیز کی کمی نہ تھی جسے پورا کرنے کے لیے سلسلۂ وحی و نبوت کو جاری کرنے کی ضرورت پیش آتی۔ درحقیقت جو مسلمان خدا کو مطلوب ہیں، جنھیں تیار کرنے کے لیے انبیاء کی بعثت اور کتابوں کی تنزیل ہوئی اور جنھوں نے اسلامی نقطۂ نظر سے کبھی کوئی قابل قدر کام کیا ہے یا آج کر سکتے ہیں وہ صرف دوسری ہی قسم کے مسلمان ہیں۔

یہ چیز کچھ اسلام ہی کے لیے خاص نہیں ہے بلکہ دنیا میں کسی مسلک کا جھنڈا بھی ایسے پیروؤں کے ہاتھوں کبھی بلند نہیں ہوا ہے جنھوں نے اپنے مسلک کے اقرار اور اس کے اصولوں کی پابندی کو اپنی کل زندگی کے ساتھ صرف ضمیمہ بنا کر رکھا ہو اور جن کا جینا اور مرنا اپنے مسلک کے سوا کسی اور چیز کے لیے ہو۔ آج بھی آپ دیکھ سکتے ہیں کہ ایک مسلک کے حقیقی اور سچے پیرو صرف وہی لوگ ہوتے ہیں جو دل و جان سے اس کے وفادار ہیں، جنھوں نے اپنی پوری شخصیت کو اس میں گم کر دیا ہے اور جو اپنی کسی چیز کو حتیٰ کہ اپنی جان اور اپنی اولاد تک کو اس کے مقابلے میں عزیز تر نہیں رکھتے۔ دنیا کا ہر مسلک ایسے ہی پیرو مانگتا ہے اور اگر کسی مسلک کو دنیا میں غلبہ نصیب ہو سکتا ہے تو وہ صرف ایسے ہی پیروؤں کی بدولت ہو سکتا ہے۔ البتہ اسلام میں اور دوسرے مسلکوں میں فرق یہ ہے کہ دوسرے مسلک اگر انسانوں سے اس طرز کی فنائیت اور فدائیت اور وفاداری مانگتے ہیں تو یہ فی الواقع انسان پر ان کا حق نہیں ہے بلکہ یہ ان کا انسان سے ایک بے جا مطالبہ ہے۔ اس کے برعکس اسلام اگر انسان سے اس کا مطالبہ کرتا ہے تو یہ اس کا عین حق ہے۔ وہ جن چیزوں کی خاطر انسان سے کہتے ہیں کہ تو اپنے آپ کو اور اپنی زندگی کو اور اپنی پوری شخصیت کو ان پر تج دے ان میں سے کوئی بھی ایسی نہیں ہے جس کا فی الواقع انسان پر یہ حق ہو کہ اس کی خاطر انسان اپنی کسی شے کو قربان کرے۔ لیکن اسلام جب خدا کے لیے انسان سے یہ قربانی مانگتا ہے وہ حقیقت میں اس کا حق رکھتا ہے کہ اس پر سب کچھ قربان کر دیا جائے۔ آسمان اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ کا ہے۔ انسان خود اللہ کا ہے۔ جو کچھ انسان کے پاس ہے اور جو کچھ انسان کے اندر ہے سب اللہ کا ہے اور جن چیزوں سے انسان دنیا میں کام لیتا ہے وہ سب بھی اللہ کی ہیں۔ اس لیے عین تقاضائے عدل اور عین مقتضائے عقل ہے کہ جو کچھ اللہ کا ہے وہ اللہ ہی کے لیے ہو۔ دوسروں کے لیے یا خود اپنے مفاد اور اپنے نفس کے مرغوبات کے لیے انسان جو قربانی بھی کرتا ہے وہ دراصل ایک خیانت ہے الّا یہ کہ وہ خدا کی اجازت سے ہو۔ اور خدا کے لیے جو قربانی کرتا ہے فی الحقیقت وہ ادائے حق ہے۔ لیکن اس پہلو سے قطع نظر کرتے ہوئے مسلمانوں کے لیے ان لوگوں کے طرز عمل میں ایک بڑا سبق ہے جو اپنے باطل مسلکوں کی خاطر اور اپنے نفس کے جھوٹے معبودوں کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر رہے ہیں اور اس استقامت کا ثبوت دے رہے ہیں جس کی نظیر مشکل ہی سے تاریخ انسانی میں ملتی ہے۔ کس قدر عجیب بات ہو گی اگر باطل کے لیے انسانوں سے ایسی کچھ فدائیت اور فنائیت ظہور میں آسکے اور حق کے لیے اس کا ہزارواں حصہ بھی نہ ہو سکے۔

ایمان و اسلام کا یہ معیار جو اس آیت اور اس حدیث میں بیان ہوا ہے، میں چاہتا ہوں کہ ہم سب اپنے آپ کو اس پر پرکھ کر دیکھیں اور اس کی روشنی میں اپنا محاسبہ کریں۔ اگر آپ کہتے ہیں کہ آپ نے اسلام قبول کیا اور ایمان لے آئے تو دیکھیے کہ آیا فی الواقع آپ کا جینا اور مرنا خدا کے لیے ہے؟ کیا آپ اسی لیے جی رہے ہیں اور آپ کے دل اور دماغ کی ساری قابلیتیں

آپ کے جسم اور جان کی ساری قوتیں، آپ کے اوقات اور آپ کی محنتیں کیا اسی کوشش میں صرف ہو رہی ہیں کہ خدا کی مرضی آپ کے ہاتھوں پوری ہو اور آپ کے ذریعہ وہ کام انجام پائے جو خدا اپنی مسلم امت سے لینا چاہتا ہے؟ پھر کیا آپ نے اپنی اطاعت اور بندگی کو خدا ہی کے لیے مخصوص کر دیا ہے؟ کیا نفس کی بندگی، خاندان کی، برادری کی، دوستوں کی، سوسائٹی کی، اور حکومت کی بندگی آپ کی زندگی سے بالکل خارج ہو چکی ہے؟ کیا آپ نے اپنی پسند اور ناپسند کو سراسر رضائے الٰہی کے تابع کر دیا ہے؟ پھر دیکھیے کہ واقعی آپ جس سے محبت کرتے ہیں خدا کے لیے کرتے ہیں؟ جس سے نفرت کرتے ہیں خدا کے لیے کرتے ہیں؟ اور اس نفرت اور محبت میں آپ کے اپنے نفس کے میلان کا کوئی حصہ شامل نہیں رہا ہے؟ پھر کیا آپ کا دینا اور روکنا بھی خدا کی خاطر ہو چکا ہے؟ اپنے پیٹ اور اپنے نفس سمیت دنیا میں آپ جس کو جو کچھ دے رہے ہیں اسی لیے دے رہے ہیں کہ خدا نے اس کا حق مقرر کیا ہے اور اس کو دینے سے صرف خدا کی رضا آپ کو مطلوب ہے؟ اور اسی طرح جس سے آپ جو کچھ روک رہے ہیں وہ بھی اسی لیے روک رہے ہیں کہ خدا نے اسے روکنے کا حکم دیا ہے اور اس کے روکنے میں آپ کو خدا کی خوشنودی حاصل ہونے کی تمنا ہے؟ اگر آپ یہ کیفیت اپنے اندر پاتے ہیں تو اللہ کا شکر کیجیے کہ اس نے آپ پر نعمت ایمان کا اتمام کر دیا۔ اور اگر اس حیثیت سے آپ اپنے اندر کمی محسوس کرتے ہیں تو ساری فکریں چھوڑ کر بس اسی کمی کو پورا کرنے کی فکر کیجیے اور اپنی تمام کوششوں اور محنتوں کو اسی پر مرکوز کر دیجیے، کیونکہ اسی کسر کے پورے ہونے پر دنیا میں آپ کی فلاح اور آخرت میں آپ کی نجات کا مدار ہے۔ آپ دنیا میں خواہ کچھ بھی حاصل کر لیں، اُس کے حصول سے اُس نقصان کی تلافی نہیں ہو سکتی جو اس کسر کی بدولت آپ کو پہنچے گا۔ لیکن اگر یہ کسر آپ نے پوری کر لی تو خواہ آپ کو دنیا میں کچھ حاصل نہ ہو پھر بھی آپ خسارے میں نہ رہیں گے۔

اجلاس چہارم

(تاریخ ایضاً)

نماز جمعہ کے بعد پھر اجلاس منعقد ہوا۔ چونکہ امیر جماعت کی طبیعت خراب ہو گئی تھی، اس لیے اجلاس کی کارروائی کا آغاز مولانا امین احسن صاحب اصلاحی کی قیادت میں ہوا۔ اور جنوبی ہند کی بقیہ رپورٹیں پیش کی گئیں۔ ان رپورٹوں پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا امین احسن صاحب نے فرمایا:-

جو مشکلات جنوبی ہند کی جماعتوں نے بیان کی ہیں وہ کوئی بڑی اہمیت نہیں رکھتیں، نہ ان سے پریشان ہونے کی کوئی وجہ ہے، بلکہ فی الحقیقت ایسی رکاوٹوں کا تو خندہ پیشانی سے استقبال کرنا چاہیے۔ جو لوگ ہمارے لٹریچر سے دوسروں کو روکتے ہیں وہ تو ایک طرح سے اس کے پھیلنے میں مددگار بن رہے ہیں کیونکہ انسانی فطرت کا طبعی خاصہ یہ ہے کہ جس چیز سے اس کو روکا جاتا ہے اس کی طرف وہ اور زیادہ راغب ہوتا ہے۔

اس کے بعد ایک صاحب نے اپنے ایک اشتراکی دوست کا خط پڑھ کر سنایا جس میں انھوں نے جماعت کے لٹریچر سے متاثر ہونے کے بعد اپنے خیالات کی تبدیلی کا حال تفصیل سے بیان کیا تھا۔ اسی دوران میں امیر جماعت تشریف لے آئے اور باقی کارروائی ان کی قیادت میں جاری رہی۔

اس کے بعد دہلی اور یوپی کی رپورٹیں پیش ہوئیں۔ ان رپورٹوں کے سلسلے میں بعض ممتاز علمائے کرام کے وہ فتوے بھی پڑھ کر سنائے گئے جو انھوں نے "رسالہ دینیات" کے متعلق تحریر فرمائے ہیں، اور جنھیں ایک گروہ اس غرض کے لیے استعمال کر رہا ہے کہ یہ رسالہ بعض مدارس کی تعلیم دینیات کے نصاب سے خارج کیا جائے۔

ان رپورٹوں پر تبصرہ کرتے ہوئے امیر جماعت نے فرمایا:-

(۱) جیسا کہ آپ حضرات نے اپنی رپورٹوں کے دوران میں بیان کیا ہے، اور میں بھی دیکھ رہا ہوں، بعض گروہ خواہ مخواہ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ ہماری ان سے کوئی مخالفت ہے اور اس بنا پر جگہ جگہ انھوں نے ہمارے راستے میں روکاوٹیں ڈالنے اور ہمارے خلاف بدگمانیاں پھیلانے کا سلسلہ شروع کر دیا ہے، حالانکہ ہماری نہ ان سے کوئی لڑائی ہے اور نہ ہم نے کبھی ان کو اپنا حریف سمجھا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہم نے مسلمانوں کی مختلف جماعتوں کے طریق کار اور ان کی سیاسی پالیسی پر اپنے لٹریچر میں تنقید کی ہے لیکن اس تنقید کی غرض لڑائی نہ تھی بلکہ صرف یہ تھی کہ یہ جماعتیں ہمارے نقطۂ نظر سے واقف ہوں اور اگر ان کا دل گواہی دے کہ ہمارا نقطۂ نظر صحیح ہے تو اس کو ملحوظ رکھ کر اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کریں۔ اس قسم کی تنقید بہر حال اصلاح کے لیے ناگزیر ہوتی ہے اور اس کے بغیر دنیا میں کہیں بھی حالات کی اصلاح نہیں ہوا کرتی۔ ایسی تنقید کو ہمیشہ ترقی پسند اور معقولیت پسند جماعتیں برداشت کرتی ہیں بلکہ اس سے فائدہ اٹھانے کی بھی کوشش کرتی ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ ہندوستان میں تنقید کو ہمیشہ دشمنی ہی پر محمول کیا جاتا ہے۔ آپ خواہ کسی پر کتنی ہی مخلصانہ اور ہمدردانہ تنقید کریں اور آپ کی نیت خالص اصلاح طلبی ہی کی کیوں نہ ہو مگر کسی پر تنقید کرنے کے بعد مشکل ہی سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اس کے جواب میں آپ کو کاٹ کھانے پر آمادہ نہ ہو جائے گا۔

یہ سب ہندوستان کے اخلاقی اور عقلی تنزل کا نتیجہ ہے اور اگر اس کے اسباب کو ہم اچھی طرح سمجھ لیں تو اس قسم کے مظاہر کو دیکھ کر کبھی برافروختہ نہ ہوں بلکہ ان لوگوں کے ساتھ ہمدردانہ یا کم از کم صابرانہ رویہ اختیار کریں۔ میں دیکھتا ہوں کہ کہیں کہیں آپ حضرات کی رپورٹوں میں ان مخالفتوں پر غصے اور ناراضی کا رنگ پایا جاتا ہے، اس چیز کو اپنے اندر سے نکال دیجیے۔ جہاں جہاں آپ کو ان مخالفتوں سے سابقہ پیش آئے وہاں نہایت معقولیت اور ٹھنڈے طریقے سے مخالفین کو سمجھا دیجیے کہ ہماری اصل لڑائی تم سے نہیں بلکہ نظامِ باطل سے ہے۔ ہم اُسے غلط سمجھتے ہیں اور اسی پر چوٹ لگانا چاہتے ہیں۔ اگر تم نے اپنے آپ کو اس نظام سے وابستہ کر رکھا ہے تو جس حد تک تمھاری اس سے وابستگی ہے اسی حد تک ضمناً تم پر بھی چوٹ لگے گی لیکن ہمارے اصل ہدف تم نہ ہو گے بلکہ نظامِ باطل ہی ہوگا۔ لیکن اگر تمھارا اس نظام سے کوئی رشتہ نہیں ہے تو ہماری کسی سرگرمی سے تمھیں پریشان ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ جو تیر دوسری طرف چھوڑا جا رہا ہو اسے تم خواہ مخواہ اپنے سینے کی طرف کیوں کھینچنا چاہتے ہو؟ اس فہمائش کے بعد جو لوگ اپنی مخالفانہ باتوں سے باز نہ آئیں انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیجیے۔ ان کی باتوں کا نہ جواب دیجیے نہ ان پر مشتعل ہو جیے۔ خوب سمجھ لیجیے کہ ان کی مخالفانہ حرکات، ان کی اشتعال انگیزیاں، ان کے غلط الزامات اور ان کی تمام مخالفانہ تدبیریں خود انھیں کے لیے مضر ثابت ہوں گی، بشرطیکہ آپ کا رویہ غایت درجہ شریفانہ اور کریمانہ اور حلیمانہ ہو اور آپ بالکل راست باز انسانوں کی طرح سیدھے سیدھے اپنا کام کرتے چلے جائیں۔ جب ایک طرف آپ کی روش یہ ہوگی اور دوسری طرف

ان کا مخالفانہ رویہ اخلاق اور راستی سے دور ہوتا چلا جائے گا تو آپ دیکھیں گے کہ ملک کا ضمیر ان کی حرکات سے خود بخود بیزار ہونے لگے گا اور لوگ ان سے کٹ کر آپ کی طرف مائل ہو جائیں گے۔ لیکن اگر آپ بھی مشتعل ہو کر ان کے جواب میں دو بدو شروع کر دیں تو جیسے وہ ہیں ویسے ہی آپ ہو کر رہیں گے اور اس لڑائی میں ان کی طرح آپ بھی کھوئے جائیں گے۔ دراصل وہ شیطان ہے جو داعیانِ حق کو ان کے راستے سے ہٹانے کے لیے اشتعال دلاتا اور نفسانی لڑائی لڑنے پر آمادہ کرتا ہے۔ اس باب میں آپ حضرات میرے ان حواشی کو بغور پڑھیں جو میں نے تفہیم القرآن میں سورہ اعراف کے آخری رکوع پر لکھے ہیں۔ انشاء اللہ وہ بہت مفید ثابت ہوں گے۔

(۲) اس سے پہلے اکثر خطوط سے اور یہاں جو رپورٹیں پیش ہوئی ہیں ان سے بھی اندازہ ہوا کہ ہمارے رفقاء اور ہم خیال اصحاب کے حلقے میں اشتراکیت کے بڑھتے ہوئے طوفان سے ایک اضطراب پیدا ہو گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اشتراکی تحریک اب روس کی کامیابی کی بدولت بہت زور پکڑ گئی ہے اور حکومت نے اپنی مصلحتوں کی خاطر اسے قوت حاصل کرنے کا جو موقع دیا ہے وہ بھی اس کے لیے کافی مفید ثابت ہوا ہے، لیکن ان چیزوں سے مضطرب ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اور اضطراب کے ساتھ اگر کوئی قدم اٹھایا گیا تو وہ فائدہ مند ہونے کے بجائے الٹا مضر ثابت ہوگا۔ یہ صحیح ہے کہ اشتراکیت عوام کے سفلی جذبات اور ان کی خواہشاتِ نفس سے اپیل کرنے کی بنا پر آگ کی طرح پھیلنے کی خاصیت رکھتی ہے، یہ بھی صحیح ہے کہ ایک مدتِ دراز سے اس کا مسلسل پروپیگنڈا ہوتا رہا ہے، اس کے پاس ایک بہت طاقتور لٹریچر ہے اور کثیر التعداد کارکن موجود ہیں، دنیا کے مختلف ممالک میں اس کی بہت کامیاب اشاعت ہو چکی ہے، اور ایک عظیم الشان سلطنت اس کی علمبردار ہے جسے تازہ فتوحات نے غیر معمولی اثر اور رسوخ بخش دیا ہے، ان وجوہ سے یہ بہت زیادہ بعید از قیاس نہیں ہے کہ ایک مرتبہ یہ تحریک ایک سیلاب کی طرح ہمارے ملک اور دوسرے بہت سے ملکوں پر چھا جائے گی۔ لیکن ان پہلوؤں کے ساتھ بعض دوسرے پہلو بھی ہیں جنھیں ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔ ہندوستان میں اور اس طرز کے غلام ذہنیت رکھنے والے ملکوں میں اس تحریک کی ترقی کا انحصار تمام تر روس کی طاقت پر ہے۔ جس وقت روس جرمنی سے پٹ رہا تھا آپ نے دیکھا ہوگا کہ اس وقت ہندوستان میں اشتراکیت بھی دم توڑ رہی تھی۔ جب روس از سرِ نو سنبھل کر اٹھا اور جرمنی کے مقابلے میں کامیابی حاصل کرتا چلا گیا تو یہاں بھی اشتراکیت کے جسم میں روح دوڑنے لگی۔ اس لیے یہ نتیجہ نکالنا صحیح ہے کہ اشتراکیت کا گرنا اور اٹھنا روس کے دامن کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔

لیکن روس کا حال یہ ہے کہ اب وہ ایک بین الاقوامی اشتراکی تحریک کی پوزیشن سے ہٹتے ہٹتے ٹھیک اس مقام پر آ رہا ہے جہاں نازی جرمنی کھڑا تھا، یعنی اس کی اشتراکیت اب قوم پرستانہ اشتراکیت (National Socialism) ہے اور وہ بہت تیزی کے ساتھ قیصریت (Imperialism) کے میدان میں امریکہ اور انگلستان کا حریف بن رہا ہے۔ یہ چیز ممکن ہے کہ روس کی قیصریت کو اتنی جلدی نہ لے بیٹھے لیکن ایک بین الاقوامی تحریک کی حیثیت سے اشتراکیت کو یقیناً لے بیٹھے گی۔ ایک بین الاقوامی تحریک کی کامیابی سراسر اس امر پر منحصر ہوتی ہے کہ اس کے علمبردار شخصی اور قومی اور طبقاتی اغراض سے بالاتر ہو کر، تمام انسانوں کو مساویانہ حیثیت سے، قومی امتیازات اور تعصبات کے بغیر اپنا شریک و سہیم بنائیں اور کامیابی کے دور میں جو کچھ فوائد ان کو حاصل ہوں ان سب میں اپنے تمام ہم خیالوں کو برابر کا حصہ دار ٹھہرائیں، حتیٰ کہ ان کے اندر اتنی

فراخ حوصلگی موجود ہو کہ جس سے کل ان کی لڑائی تھی وہ بھی اگر ان کا ہم مسلک ہو جائے تو وہ اس کے ساتھ اپنے انتقام اور دشمنی اور تعصبات کے سارے جذبات کو ختم کر کے بھائیوں کا سا سلوک کریں۔ ظاہر ہے کہ اس کے لیے بہت اعلیٰ درجے کے اخلاق درکار ہیں۔ مگر مادہ پرست اور وہ مادہ پرست جس کا سب سے بڑا اپیل معاشی اپیل ہو، ایسے بلند اخلاق لا کہاں سے سکتے ہیں؟ یہی وجہ ہے کہ روس جتنا جتنا دنیوی کامیابیوں کی منزلیں طے کرتا چلا گیا اتنا ہی زیادہ قوم پرست ہوتا چلا گیا اور آج کا روسی اشتراکی اپنے اندر اتنی بلند ہمتی نہیں پاتا کہ جو منافع اس کو اپنی فوجی کامیابیوں سے حاصل ہوئے ہیں ان میں وہ اپنی قوم کے ساتھ دوسروں کو برابر کا شریک کرے۔ اب وہ جو کچھ چاہتا ہے اپنی قوم کے لیے چاہتا ہے۔ البتہ اشتراکیت کے بین الاقوامی اپیل کو وہ صرف اپنے ایک قومی ہتھیار کی حیثیت سے استعمال کر رہا ہے تاکہ مختلف قوموں میں اس کے ذریعے سے ففتھ کالم پیدا کرے اور پھر اس ففتھ کالم کو آلۂ کار بنا کر اپنے قومی امپریلزم کی جڑیں پھیلائے۔ گو آنکھوں والے اسے ابھی سے دیکھ رہے ہیں لیکن عنقریب وہ وقت آنے والا ہے جب روس کی سیاست اس معاملے میں بالکل برہنہ ہو جائے گی اور اس وقت غلام قوموں کے وہ لوگ جو آج اسے اپنا مقتدا و پیشوا بنائے ہوئے ہیں اور اس کو مظلوموں کا حامی اور غلاموں کی آزادی کا علمبردار سمجھ رہے ہیں اس سے مایوس ہو جائیں گے۔

اس بیان سے میری یہ غرض نہیں ہے کہ آپ کو اشتراکی خطرے سے بالکل مطمئن ہو کر بیٹھ جانے کا مشورہ دوں بلکہ میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اشتراکی خطرے سے جتنا اضطراب آپ میں سے بعض لوگ محسوس کرتے ہیں اتنے زیادہ اضطراب کا کوئی موقع نہیں ہے۔ اس خطرے کو جو لوگ تیزی کے ساتھ قریب آتا دیکھتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ جلدی سے کوئی جوابی پروپیگنڈا شروع کر دیا جائے یا اشتراکیت کے خلاف مضامین اور کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ چھیڑ دیا جائے یا ہمارے کارکن جلدی سے کسانوں اور مزدوروں میں جا کر کوئی ایسا کام شروع کریں جو انھیں اشتراکیوں کی گود سے فوراً چھین لے۔ لیکن اس طرح کی جلد بازانہ تدبیریں کارگر نہیں ہو سکتیں۔ میں نے پچھلے سال تعلیم بالغان کی جو سکیم پیش کی تھی وہ اسی لیے تھی کہ ہمارے وہ ارکان جماعت جو عوام میں کام کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں مضبوط اور گہری بنیادوں پر ایک ایسی عوامی تحریک کی عمارت اٹھائیں جو نہ صرف یہ کہ محنت پیشہ طبقوں کی اخلاقی اور ذہنی اصلاح کرے بلکہ اس کے ساتھ ہی ان کو تمام معاشی، سیاسی، اور مذہبی فتنے پھیلانے والی تحریکوں سے بھی محفوظ کر دے، نیز جس سے بتدریج ہمارے پاس طبقۂ عوام کے ایسے قابلِ اعتماد کارکنوں کی ایک معتدبہ تعداد فراہم ہوتی چلی جائے جو وسیع پیمانے پر ہماری عوامی تحریک کو ملک میں پھیلا سکے۔ جیسا کہ میں اس سے پہلے اجتماع دارالاسلام اور اجتماع دہلی کی تقریروں میں کہہ چکا ہوں اس کام کا طریقہ یہ ہے کہ ہمارا ہر تعلیم یافتہ کارکن اپنے آس پاس کی آبادی میں سے طبقۂ عوام کے آٹھ دس آدمیوں کو تعلیم کا شوق دلائے اور اسے پڑھانے کے لیے بلا معاوضہ خود اپنی خدمات پیش کرے۔ اس تعلیم کے مصارف کا کوئی بار ان پر نہ ڈالا جائے۔ وقت مقرر کرنے میں بھی اپنی سہولت کی بہ نسبت ان کی سہولت کا زیادہ خیال رکھا جائے جگہ بھی ان سے نہ مانگی جائے بلکہ خود فراہم کی جائے۔ پہلے کچھ مدت صرف کر کے ان کو نوشت و خواند کے قابل بنا دیا جائے۔ پھر خود اپنی جماعت کے لٹریچر میں سے آسان آسان چیزیں سبقاً سبقاً پڑھائی جائیں اور اس دوران میں نہ صرف اپنے خیالات سے ان کے ذہن کو متاثر کیا جائے بلکہ ان کے ساتھ مساوات، ہمدردی، اخوت اور عالی ظرفی کا ایسا برتاؤ کیا جائے جس سے ان کے دل مسخر

ہو جاتی ہیں۔ ان کے دکھ درد میں شریک ہونے کی کوشش کیجیے، ان کی ہر مصیبت اور تکلیف میں ممکن ہو تو عملاً کام آیئے ورنہ کم از کم ہمدردی کا اظہار کیجیے، اپنے طرزِ عمل سے ان پر ثابت کیجیے کہ آپ کسی قسم کے امتیازات کے قائل نہیں ہیں، پڑھے لکھے اور اونچے طبقوں میں جو چھوٹا فخر پایا جاتا ہے اس کا کوئی شائبہ آپ کے اندر نہ پایا جائے۔ اس کے ساتھ نہایت مخلصانہ طریقے سے ان کی اخلاقی کمزوریوں کو دور کرنے کی کوشش کیجیے۔ ان کے اندر جو "انسان" سو رہا ہے، جسے معاشی خستہ حالی نے، جہالت نے، سوسائٹی کی اخلاقی اور ذہنی پستی نے سلا دیا ہے اسے جگایئے اور ان کے اندر اس انسانی عظمت کا شعور پیدا کیجیے جس کی بنیاد اسلام اور ایمان پر قائم ہوتی ہے۔ پھر یہ بات بھی ان کے ذہن نشین کیجیے کہ ان کی تمام معاشی مشکلات اور ان کے ان تمام دکھوں کا جو موجودہ تمدن نے پیدا کر دیئے ہیں صرف ایک ہی علاج ہے اور وہ یہ ہے کہ زندگی کا نظام خالص اسلامی بنیادوں پر قائم ہو۔ اس طرح جن آٹھ دس آدمیوں کو آپ تیار کریں گے وہ گویا عوام میں کام کرنے کے لیے آپ کے تربیت یافتہ کارکن بن جائیں گے اور پھر آپ ان کو انہی کے طبقے میں اپنے اخلاقی و ذہنی اثرات پھیلانے کا ذریعہ بنا سکیں گے۔ یہ طریق کار اپنے نتائج جلدی نہیں دکھا سکتا جس طرح ایک اشتراکی کارکن تھوڑی مدت کے اندر معاشی اپیل کر کے ایک مزدور سبھا یا کسان سبھا کھڑی کر لیتا ہے یا ٹریڈ یونین (Trade union) بنا ڈالتا ہے اس طرح جلدی سے آپ کوئی بھیڑ اپنے گرد جمع نہ کر سکیں گے۔ لیکن جو طریق کار میں آپ کو بتا رہا ہوں اس پر اگر آپ عمل کریں تو آپ دیکھ لیں گے کہ چند سال کے اندر ایک ایسی مضبوط عوامی تحریک اٹھ کھڑی ہو گی جس کا مقابلہ کرنا کسی دوسری تحریک کے لیے مشکل ہو گا۔ پیٹ کی اپیل پر جمع ہونے والی بھیڑ نہ کبھی وہ استقامت دکھا سکتی ہے جو اعلیٰ درجے کی اخلاقی بنیادوں پر اٹھنے والے چند مٹھی بھر لوگ دکھا سکتے ہیں، اور نہ عامۃ الناس میں معبودِ شکم کے پجاریوں کو وہ اخلاقی اثر کبھی حاصل ہو سکتا ہے جو سچے خدا پرستوں کو حاصل ہو سکتا ہے۔

(۳) بعض مقامات کی رپوٹوں سے یہ معلوم کر کے بہت افسوس ہوا کہ جب ہمارے کارکنوں نے کہیں مزدور طبقے کے اندر اشتراکی کارکنوں کے پھیلائے ہوئے زہر کو نکالنے کی کوشش کی تو اس طبقے کے مسلمانوں نے انھیں جواب دیا کہ علما تو ان اشتراکی کارکنوں کے ساتھ موافقت کر رہے ہیں، اور انھوں نے ہمیں یقین دلایا ہے کہ اشتراکیت سے ہمارے مذہب پر کوئی آنچ نہیں آتی پھر آپ لوگ ہمیں کیوں ڈراتے ہیں کہ اشتراکیت ہم کو الحاد کی طرف لے جائے گی یا یہ کہ اشتراکیت اسلام کے خلاف ہے۔ درحقیقت ہمارے بعض علمائے کرام ہندوستان میں اسی قسم کی غلطی کر رہے ہیں جیسی اس سے پہلے روسی ترکستان کے علما کر چکے ہیں اور اس کا افسوسناک انجام دیکھ چکے ہیں۔ روسی ترکستان کا اشتراکی انقلاب کوئی بہت پرانی چیز نہیں ہے۔ اسی بیس پچیس سال کی مدت میں ہوا ہے اور وہاں اس کا یہ نتیجہ دنیا دیکھ چکی ہے کہ جو سرزمین ہزار بارہ سو سال سے اسلام کا مضبوط قلعہ بنی ہوئی تھی، جہاں سے بڑے بڑے ائمہ حدیث، ائمہ فقہ اور مشہور سلاسل صوفیہ (چشتیہ، نقشبندیہ اور سہروردیہ) کے پیشوا پیدا ہوئے، وہاں آج اسلام برائے نام بھی باقی نہیں ہے۔ مسجدیں اور خانقاہیں کلبوں اور رقص خانوں اور تعلیم دہریت کے مرکزوں میں تبدیل ہو چکی ہیں اور سابق مسلمانوں کی نسل سے پکے ملحد اشتراکی پیدا ہو رہے ہیں جن کے نزدیک محمد رسول اللہ محض سرمایہ داروں کے ایک ایجنٹ تھے اور انھوں نے اپنے وقت کے معاشی نظام کو مذہبی و اخلاقی بنیاد فراہم کرنے کے لیے وحی و رسالت کا ڈھونگ رچایا تھا۔ یہ عظیم الشان کامیابی اشتراکیت کو اس سرزمین میں حاصل ہوئی جہاں آج سے پچیس سال پہلے تک پرانے طرز کی مذہبیت

ہندوستان سے بہت زیادہ گہرا رنگ رکھتی تھی اور اسلام سے لوگوں کی عقیدت اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ کوئی شخص یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ چند سال کے اندر اس سرزمین میں کوئی اسلام کا نام لینے والا بھی نہ پایا جائے گا۔ مگر آپ کو معلوم ہے کہ اشتراکی مبلغین کو یہ کامیابی حاصل کیسے ہوئی؟ اس کا ذریعہ صرف ایک تھا اور وہ یہ کہ اشتراکیت کے مبلغ معصوم صورتیں لیے ہوئے، دکھی انسانیت کے حامی بن کر علمائے کرام کے پاس پہنچے اور سب سے پہلے ان کا اعتماد حاصل کیا۔ ترکستان میں نئے زمانے کے تعلیم یافتہ مگر صحیح العقیدہ مسلمان جو تھوڑے بہت موجود تھے انھوں نے علمائے کرام کو آگاہ کرنے کی کوشش کی کہ یہ اشتراکیت کی تحریک فی الواقع اسلام کی نفی ہے۔ لیکن علماء، اول تو بسم اللہ کے گنبد میں بیٹھے ہوئے تھے اور انھیں جدید زمانے کی تحریکات کا براہ راست کوئی علم نہ تھا۔ پھر مزید براں وہ ان روشن خیال مسلمانوں سے اس بنا پر بھی سخت ناراض تھے کہ یہ لوگ شرح جامی اور مطول جیسی کتابوں کو نصاب سے خارج کر کے نیا تعلیمی نصاب بنانا چاہتے تھے اس لیے انھوں نے شرح جامی کو منسوخ کرنے والے مسلمانوں کی بات ماننے کے بجائے اپنی ساری اخلاقی امداد ان ملاحدہ کے لیے وقف کر دی جو قرآن کو منسوخ کرنے اٹھے تھے۔ پھر جب علما کے واسطے سے اشتراکیوں کو ترکستانی عوام میں اعتماد و اعتبار حاصل ہو گیا تو دیکھتے دیکھتے انھوں نے عام باشندوں کو مٹھی میں لے کر ملک کے سیاسی نظام پر کامل تسلط حاصل کر لیا اور اس کے بعد سب سے پہلے جس گروہ کی خبر لی وہ یہی علماء و مشائخ تھے جن کے اعتماد سے فائدہ اٹھا کر انھوں نے اقتدار حاصل کیا تھا۔ اشتراکی انقلاب کی تکمیل کے بعد ترکستان کے طول و عرض میں جس طرح علماء اور صوفیہ کا قتل عام کیا گیا اور مذہبی طبقوں کو جیسے جیسے شدید مظالم کے ساتھ ختم کیا گیا اس کی داستان اتنی دردناک ہے کہ چنگیزی مظالم کی تاریخ بھی اس کے سامنے گرد ہو جاتی ہے۔ یہ سب کچھ اسی بیس پچیس سال کے دوران میں ہوا ہے اور اس سرزمین میں ہوا ہے جو سرحد ہندوستان سے پانچ سات سو میل سے زیادہ دور نہیں ہے۔ لیکن ہمارے مذہبی پیشواؤں کو اس کی کچھ بھی خبر نہیں اور وہ آج ہندوستان میں پھر وہی سمرقند و بخارا کی تاریخ دہرانے کے لیے تیار ہیں۔ ان کے بڑے بڑے اجتماعات میں اشتراکی لیڈروں اور اشتراکیت زدہ لوگوں کو استقبالیہ خطبے پڑھنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ ان کے ذمہ دار آدمی اشتراکی کارکنوں کے ساتھ عوام میں کام کرنے جاتے ہیں، اور اچھے اچھے مشہور علماء کی زبان سے یہ فقرے سننے میں آتے ہیں کہ اسلام اور اشتراکیت میں اس کے سوا کچھ فرق نہیں ہے کہ ایک میں خدا کا تصور ہے اور دوسرے میں نہیں ہے، ورنہ اشتراکی نظام بالکل اسلامی نظام کا ایک نیا ایڈیشن ہے۔ خدا نہ کرے کہ اس نادانی کا ہندوستان میں بھی وہی نتیجہ رونما ہو جو ترکستان میں ہو چکا ہے، لیکن خدا کے ہاں تو یہ لوگ اپنی ذمہ داری سے ہرگز بری نہ ہو سکیں گے خواہ ہندوستان ان کی غلطی کے نتائج سے بچ جائے۔

(۴) جن حضرات علماء نے میرے رسالۂ دینیات پر فتوے تحریر فرمائے ہیں میں شخصی طور پر بھی ان کا نیاز مند ہوں اور ان کے علم و فضل کا بھی احترام میرے دل میں ہے۔ ان تک میری یہ گذارش پہنچا دی جائے کہ فتوے تحریر فرمانے اور انھیں اہل فتنہ کے ہاتھ میں دینے کے بجائے وہ براہ کرم میری کتابوں پر علمی تنقید فرمائیں۔ مجھے اپنی کسی غلطی کو غلطی ماننے میں اور اس کی اصلاح کرنے میں نہ پہلے کبھی تامل تھا اور نہ اب ہے۔ البتہ پہلے بھی یہ عرض کرتا رہا ہوں اور اب بھی اس کا اعادہ کرتا ہوں کہ جس چیز کو غلطی کہا جاتا ہے اسے تعین کے ساتھ مجھے بتایا جائے تاکہ میں اس کی اصلاح کر سکوں۔ مبہم اعتراضات سے یہ معلوم کرنا مشکل ہوتا ہے کہ فی الواقع وہ چیز کیا ہے جس پر اعتراض ہے۔

اس کے بعد یہ اجلاس ختم ہوا اور نماز مغرب کے بعد پانچواں اجلاس شروع ہوا۔ عصر سے مغرب تک وقفہ دیا گیا۔

اجلاس پنجم

(بتاریخ ایضاً بعد نماز مغرب)

سب سے پہلے اعلان کیا گیا کہ بعد نماز عشا مجلس شوریٰ کا اجلاس ہوگا اور ارکان شوریٰ کے نام سنا دیے گئے۔ اس کے بعد علی گڑھ، شاہجہان پور، بنارس، سنگاہی، لکھنؤ، میرٹھ اور بارہ بنکی کی رپوٹیں پیش ہوئیں۔ شاہجہان پور کے مقامی امیر نے اپنی رپورٹ کے دوران میں یہ بھی اعلان کیا کہ ان کے ایک رفیق اپنی جان، مال، اور ہر چیز جماعت کے سپرد کرتے ہیں اور امیر جماعت کو حق ہے کہ جس طرح چاہیں انھیں استعمال فرمائیں۔

ان رپوٹوں پر تبصرہ کرتے ہوئے امیر جماعت نے فرمایا:۔

(۱) شاہجہانپور کے رفیق کی پیشکش بلاشبہ بہت مبارک ہے اور میں ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ کسی کی حوصلہ شکنی کروں یا کسی ایسے نیک اقدام سے کسی کو منع کروں، بلکہ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کی اس پیش کش کو قبول فرمائے اور انھیں اس پر ثابت قدم رکھے، لیکن میں چاہتا یہ ہوں کہ وہ اجتماع کے بعد گھر پہنچ کر اپنے تمام حالات کا جائزہ لے کر دو تین مہینہ کے اندر پھر ٹھنڈے دل سے فیصلہ کریں اور اگر ان کا ارادہ قائم رہے تو مجھ کو لکھیں۔ پھر میں بتاؤں گا کہ انھیں کیا کرنا چاہیے۔ یہ میں اس لیے کہتا ہوں کہ بعض مرتبہ خاص موقع پر انسان وقتی تاثر سے مغلوب ہو کر اپنی ہمت اور قوت برداشت کا صحیح اندازہ کیے بغیر ایک فیصلہ کر لیتا ہے اور بعد میں جب اصل حالات سے اس کو سابقہ پیش آتا ہے تو اس کے لیے اپنے فیصلے پر قائم رہنا محال ہو جاتا ہے۔

(۲) ایک صاحب نے اپنی رپورٹ میں بعض لوگوں کا یہ اعتراض نقل کیا ہے کہ پہلے انسان کو خود معیاری مسلمان بننا چاہیے پھر دوسروں کی اصلاح کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔ یہ ایک بہت بڑی غلط فہمی ہے۔ اس خیال کے لیے نہ شرع میں کوئی بنیاد ہے اور نہ عقل میں۔ قرآن اور حدیث سے بھی ہمیں یہی معلوم ہوتا ہے کہ خود نیک بننا اور دوسروں کو نیکی کی طرف بلانا ساتھ ساتھ ہونا چاہیے اور عقل بھی یہی چاہتی ہے کہ جس وقت آدمی پر حق منکشف ہو اسی وقت سے وہ خود بھی حق پرست بننے کی کوشش کرے اور دوسروں کو بھی حق کی طرف دعوت دے۔ ظاہر بات ہے کہ جب آپ کے ساتھ بہت سے لوگ ایک ہی مکان میں رہتے ہوں اور آپ کو معلوم ہو جائے کہ اس مکان کو آگ لگ گئی ہے تو آپ کا فرض یہی نہیں ہے کہ خود اس سے نکلنے کی کوشش کریں بلکہ آپ کا یہ بھی فرض ہے کہ اپنے دوسرے بھائیوں کو بھی اس آگ سے آگاہ کرنے اور ان کو اس مکان سے باہر نکالنے کی پوری پوری کوشش کریں۔ جو لوگ پہلے خود معیاری مسلمان بننے کی شرط لگاتے ہیں ان سے دریافت کیجیے کہ کیا ان کے پیش نظر کوئی خاص حد ایسی ہے جس پر پہنچ کر آدمی اپنے متعلق یہ رائے قائم کر سکتا ہو کہ اب وہ معیاری مسلمان بن گیا ہے۔ شاید یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ جس وقت آپ کے اندر اپنے متعلق یہ غلط فہمی پیدا ہوئی کہ آپ کامل ہو گئے ہیں اسی وقت سے آپ کے ناقص ہونے کی ابتدا ہو جائے گی اور دوسروں کی تکمیل کی کوشش کے لیے وہی وقت سب سے زیادہ غیر موزوں ہوگا۔

(۳) رپوٹوں کے سلسلے میں ایک اور بات مجھے خاص طور پر کھٹکی ہے۔ وہ یہ کہ جابجا غیر ضروری کسر نفسی اور بے جا انکسار سے کام لیا گیا

ہے۔ جس طرح یہ بات صحیح نہیں کہ اپنی کارروائیوں اور سرگرمیوں کو بڑھا چڑھا کر اور مبالغے سے بیان کیا جائے اسی طرح یہ بات بھی ٹھیک نہیں ہے کہ انھیں خواہ مخواہ سکیڑ کر اور حقیر شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی جائے۔ جو کچھ ہوا ہے اور جو ہو رہا ہے اسے بلاکم وکاست ٹھیک ٹھیک بیان کر دینا چاہیے۔ اپنوں اور دوسروں کا جائزہ لینے میں قطعاً کسی کمی بیشی سے کام نہ لیا جائے۔ آپ کی رپورٹیں تو گویا ایک ایسا آئینہ ہونی چاہئیں جن میں آپ کی کارروائیوں، آپ کے ارکان و ہمدردوں اور علاقہ کے دوسرے لوگوں اور حالات کا بے لاگ عکس موجود ہو۔

اس کے بعد اجلاس ختم ہوا اور عشاء کی اذان ہوئی۔

اجلاس مجلس شوریٰ

(بعد نماز عشا)

عشا کی نماز اور کھانے کے بعد امیر جماعت کے دفتر میں مجلس شوریٰ کا اجلاس منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں حسب ذیل اصحاب شریک ہوئے۔

(۱) امیر جماعت (سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی) (۲) مولانا امین احسن صاحب اصلاحی۔
(۳) مولانا مسعود عالم صاحب ندوی۔ (۴) مولانا محمد اسماعیل صاحب مدراسی۔
(۵) غازی محمد عبدالجبار صاحب دہلی۔ (۶) مولوی حکیم محمد عبداللہ صاحب روڑی۔
(۷) ملک نصر اللہ خاں صاحب عزیز (مدیر کوثر لاہور)۔ (۸) مولانا نذیر الحق صاحب میرٹھی۔
(۹) میاں طفیل محمد صاحب (قیم جماعت)۔ (۱۰) سید محمد حسنین صاحب بہاری (قیم جماعت صوبہ بہار)۔
(۱۱) قاضی حمید اللہ صاحب سیالکوٹ۔ (۱۲) چودھری محمد اکبر صاحب سیالکوٹ۔
(۱۳) مولوی محمد یونس صاحب حیدرآباد (دکن)۔ (۱۴) سید عبدالعزیز صاحب شرقی۔
(۱۵) حکیم محمد خالد صاحب الہ آباد۔ (۱۶) جے۔ محمد بشیر صاحب بمبئی۔

اس اجلاس میں مرکز کی تعمیر اور تعلیمی اسکیم کے مسائل پر غور کیا گیا اور تمام حالات کا جائزہ لینے کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ ابتدائی تعلیم کا کام شروع کرنے کے لیے حالات اس وقت سازگار نہیں ہیں لہذا سردست اپنی تمام توجہ عارضی ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کا کام شروع کر دینے پر مرکوز کر دینی چاہیے اور اس کے ساتھ ساتھ ابتدائی تعلیمی اسکیم کو شروع کرنے کے لیے بھی سعی جاری رہنی چاہیے۔

اجلاس ششم

(بتاریخ ۸ جمادی الاول ۱۳۶۴ھ بروز ہفتہ)

صبح ۸ بجے یہ اجلاس حسب پروگرام مسجد میں شروع ہوا۔ اس اجلاس میں سیالکوٹ، سرحد، گوجرانوالہ، لالہ موسیٰ، گجرات، لاہور، ضلع لاہور، امرتسر، فیروزپور، شہر و چھاؤنی، راہوں، پھلور، جاجہ (ہوشیارپور) لدھیانہ، کپورتھلہ، کیتھل (کرنال)، حصار،

ضلع شاہ پور اور ضلع لائل پور کی رپورٹیں پیش ہوئیں۔ اگرچہ بعض اور علاقوں کی رپورٹیں بھی باقی تھیں لیکن وقت کی کمی کے باعث فیصلہ کیا گیا کہ باقی رپورٹوں کو اجتماع عام میں نہ پیش کیا جائے بلکہ وہ اجتماع کے بعد امیر جماعت کے سامنے پیش کر دی جائیں۔

ان رپورٹوں پر تبصرہ کرتے ہوئے امیر جماعت نے فرمایا:-

بسا اوقات جسے انسان شر سمجھتا ہے، اللہ کی طرف سے اس میں خیر کا پہلو نکل آتا ہے۔ میں افسوس کر رہا تھا کہ وقت کی کمی اور اپنی خرابیٔ صحت کی وجہ سے مجھے اجتماع سے پہلے رپورٹوں کے دیکھ لینے کا موقع نہیں ملا۔ اگر یہ موقع مجھ کو مل جاتا تو بہت سی عبارتوں پر میں نشان لگا دیتا اور نشان زدہ عبارتوں کے متعلق ہدایت کر دیتا کہ اجتماع میں انھیں نہ پڑھا جائے۔ لیکن اب میں محسوس کرتا ہوں کہ اس کا موقع نہ ملنا کچھ اچھا ہی ہوا۔ پچھلے دو روز میں جو رپورٹیں یہاں پیش ہوئی ہیں ان میں آپ کے سامنے جماعت کی حالت اور ارکان کی حالت جیسی کچھ کہ فی الواقع وہ تھی ویسی ہی سامنے آگئی ہے۔ تمام اچھے اور برے پہلو بے نقاب ہو گئے۔ ہمارے کارکنوں کا مزاج، انداز فکر اور اخلاقی حال جیسا کچھ تھا وہ سب کے سامنے کھل گیا۔ اب جو تبصرہ میں کروں گا اور میرے بعد مولانا امین احسن صاحب جو تقریر کریں گے اس سے مجھے امید ہے کہ ارکان جماعت اپنے کمزور پہلوؤں کی طرف توجہ فرمائیں گے اور انھیں دور کرنے کی کوشش کریں گے۔

(۱) آج میرے پاس بہت سی شکایتیں آئی ہیں کہ مختلف مقامات کی رپورٹوں میں علماء اور دوسرے گروہوں اور جماعتوں پر تنقید میں تلخی کی گئی ہے۔ یہ شکایتیں ایک حد تک بالکل بجا ہیں۔ اختلافات اور مخالفتوں کی وجہ سے طبائع میں جھنجھلاہٹ کا پیدا ہو جانا اگرچہ کسی حد تک فطری بات ہے، لیکن فی الواقع یہ ایک کمزوری ہے اور جن لوگوں کو کسی بلند اخلاقی مقصد کے لیے کام کرنا ہو انھیں اپنے اندر سے اس کمزوری کو دور کرنا چاہیے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ جو لوگ دانستگی میں یا نادانستگی میں اس دعوت الی الخیر کی راہ روک رہے ہیں ان کے اس طرز عمل کو آپ سراہیے یا اسے برا نہ جانیے۔ ان کی غلطیوں کو غلطی کہنے سے نہ میں خود رکتا ہوں نہ آپ کو روکتا ہوں۔ واقعات کے بیان کو بھی میں روکنا نہیں چاہتا اگر فی الواقع حالات کو سمجھنے کے لیے ان کا بیان ضروری ہو۔ جہاں کسی جماعت کے غلط طرز عمل پر تنقید کرنے کی واقعی ضرورت پائی جائے وہاں زبان بند کر لینے کا مشورہ بھی میں کسی کو نہیں دیتا۔ لیکن جس چیز کو میں روکنا چاہتا ہوں وہ صرف یہ ہے کہ اس قسم کی مخالفتوں سے آپ کے مزاج میں برافروختگی اور آپ کی زبان میں تلخی پیدا ہو اور اس کے جواب میں دوسری طرف سے بات اور بڑھے۔ یہی چیزیں فتنہ کی موجب ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ ہمارے ارکان کو اس بات کا بھی لحاظ رکھنا چاہیے کہ ہماری جماعت میں جو لوگ شریک ہیں وہ مختلف گروہوں سے نکل کر آئے ہیں اور اب تک ان کی عقیدتیں اور دلچسپیاں کچھ نہ کچھ اپنے سابق گروہوں اور ان کی شخصیتوں کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اس حالت میں اگر ایک طبقے کے لوگ دوسرے طبقے والوں پر کوئی چوٹ کریں گے تو صرف یہی نہیں کہ اس طبقے پر کوئی اچھا اثر نہیں پڑے گا بلکہ اس سے یہ بھی اندیشہ ہے کہ اس طبقے سے آئے ہوئے جو لوگ ہماری جماعت میں موجود ہیں ان کے دلوں میں بھی ناراضی پیدا ہوگی۔ آپ کے سامنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد کی مثالیں موجود ہیں کہ انصار میں اسلام قبول کرنے کے بعد بھی کچھ مدت تک اوس اور خزرج کی پرانی عداوتوں کے آثار موجود تھے اور یہودی فتنہ پرداز بسا اوقات ان عداوتوں کی یاد تازہ کر کے فتنہ برپا کر دیا کرتے تھے۔ ان مثالوں سے سبق لے کر

آپ لوگوں کو اپنی تنقیدوں اور شکایتوں میں بہت زیادہ احتیاط سے کام لینا چاہیے کہ گروہی عصبیتیں خود آپ کی اپنی جماعت میں بھڑک کر کوئی فتنہ برپا نہ کریں۔

اس کے ساتھ میں ان حضرات سے بھی جو بعض گروہوں اور اشخاص کی عقیدت میں مبتلا ہیں اور اس وجہ سے تنقیدوں کی سختی کا شکوہ کرتے ہیں یہ گذارش کروں گا کہ جب آپ اس جماعت میں آئے ہیں تو اپنے اندر انصاف کی صفت پیدا کیجیے اور تمام چیزوں سے بڑھ کر حق سے عقیدت رکھیے۔ آپ کو شکایت ہے کہ بعض بڑے لوگوں کی غلط باتوں کا جب یہاں ذکر ہوا تو لوگ ہنس دیے۔ بلاشبہ یہ ہنسنا اچھا نہ تھا۔ بلاشبہ ہم کو ہر شخص کا اتنا ہی احترام ملحوظ رکھنا چاہیے جتنا ہم خود چاہتے ہیں کہ ہمارا ملحوظ رکھا جائے۔ لیکن آپ غور کیجیے کہ جو لوگ واقعی ہنسی کے قابل باتیں کرتے ہوں آخر دنیا کب تک ان پر ہنسنے سے باز رکھی جا سکتی ہے۔ خواہ ہم ان پر نہ ہنسیں لیکن بہرحال ہنسنے کے قابل باتیں کرنے کے بعد کوئی شخص ہنسے جانے سے بچ نہیں سکتا، نہ آپ کی عقیدت مندی اسے اس نقصان سے بچا سکتی ہے جو اس نے خود اپنے احترام کو پہنچایا ہے۔ اسی طرح آپ شکایت کرتے ہیں کہ بعض اشخاص اور جماعتوں پر تنقید میں سختی برتی گئی ہے۔ اس سختی کو میں بھی پسند نہیں کرتا، لیکن اس کے ساتھ آپ کو بھی یہ سوچنا چاہیے کہ جن چیزوں کی شکایت کی گئی ہے کیا وہ واقعی نہیں ہیں؟ اگر وہ واقعی ہیں تو کیا وہ حضرات جنہوں نے اس دعوتِ حق کی راہ میں رکاوٹیں ڈالنے کی کوشش کی وہ اپنے اس طرزِ عمل میں واقعی حق بجانب ہیں؟ اور اگر وہ حق بجانب نہیں ہیں تو پھر جتنی توجہ آپ دنیا سے ان کا احترام کرانے پر صرف کرتے ہیں برائے خدا اس سے آدھی ہی توجہ اس کوشش پر صرف کریں کہ وہ حضرات اپنی اس روش کو بدلیں۔ جہاں ایک طرف حق ہو اور دوسری طرف بڑی بڑی شخصیتیں ہوں وہاں اگر آپ کا دل شخصیتوں کی طرف زیادہ کھنچتا ہے تو یہ ایک بڑی خطرناک حالت ہے جس سے آپ کی اپنی حق پرستی کو صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ ایک سچے مسلمان کو سب سے پہلے جس چیز کی فکر ہونی چاہیے وہ یہ ہے کہ اس کے اندر حق کی محبت ساری محبتوں پر غالب ہو جائے، اور کوئی عقیدت اس کے دل میں ایسی باقی نہ رہے جو کسی وقت حق کی عقیدت کے مقابلے میں آکھڑی ہو۔ جہاں تک اس دعوتِ خیر کا تعلق ہے مجھے یہ کامل یقین ہے کہ کسی کی مخالفت اس کو دبانے میں کامیاب نہیں ہو سکتی بلکہ جو اس کو نقصان پہنچانے کی سعی کرے گا وہ خود نقصان اٹھائے گا۔ اس لیے میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ اس بنا پر نہیں کہہ رہا ہوں کہ کسی بڑے سے بڑے آدمی کی مخالفت سے بھی مجھے اس کام کے برباد ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ میری غرض تو صرف یہ ہے کہ ایک طرف آپ خود اپنی حق پرستی کو ایسی عقیدتوں کے زہر سے بچانے کی فکر کریں جو مخالفتِ حق کے باوجود کسی کے ساتھ لگی رہتی ہیں اور دوسری طرف تو ان حضرات کو بھی جن سے آپ عقیدت و محبت رکھتے ہیں مناعٍ للخیر بننے کے برے نتائج سے بچنے کا مشورہ دیں۔

(۲) میں نے ابھی جس چیز کی طرف اشارہ کیا ہے اس کا ایک افسوسناک ثبوت ابھی ابھی مجھ کو ایک عجیب شکایت کی صورت میں ملا ہے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ کل میں نے اشتراکیوں کے ساتھ بعض علماء کی موافقت پر اپنے دلی رنج کا اظہار کرتے ہوئے ان بدترین نتائج کا ذکر کیا تھا جو روسی ترکستان میں اشتراکی مبلغین کے ساتھ علماء کی موافقت سے نہ صرف علماء کے حق میں بلکہ خود اسلام کے حق میں رونما ہوئے۔ آج میری اس تقریر کا حوالہ دیتے ہوئے مجھ سے شکایت کی گئی ہے کہ ایک طرف تو تم علماء پر سخت تنقید کرنے سے لوگوں کو روکتے ہو اور دوسری طرف خود ایسی تنقید کرتے ہو۔ اسی قسم کی باتیں ہیں جن کی بنا پر مجھ

یہ سمجھتا ہوں کہ آپ میں سے بعض لوگ حق کی عقیدت سے کچھ بڑھ کر رجال کی عقیدت میں مبتلا ہیں۔ میں آپ کو ثابت شدہ واقعات سنا رہا ہوں کہ انشتراکی کارکنوں کے ساتھ روسی ترکستان کے علماء نے ابتداءً جو تعاون کیا تھا اس کا خمیازہ کس بری طرح سے انھوں نے بھگتا اور اس کے نتیجے میں کس طرح اسلام اس سرزمین سے بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا گیا جو بارہ سو برس تک قبۂ اسلام بنی رہی تھی۔ اس کے ساتھ میں آپ کے سامنے یہ بھی واقعات پیش کر رہا ہوں کہ بعض اچھے خاصے ذمہ دار علماء ہندوستان میں کس طرح اسی غلطی کا اعادہ کر رہے ہیں۔ آپ میری ان دونوں باتوں میں سے کسی کی بھی تردید نہیں کرتے اور نہیں کر سکتے، لیکن پھر بھی آپ کو شکایت ان حضرات سے نہیں ہے جو اسلام کے لیے اپنی نادانی سے یہ خطرہ پیدا کر رہے ہیں بلکہ آپ کو الٹی شکایت اس شخص سے ہے جو اس نادانی پر ان کو خبردار کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اسلام کی جڑوں پر تیشہ چل جانے سے آپ کو اتنی تکلیف نہیں ہوتی جتنی اپنی عقیدت کے بتوں کو ٹھیس لگنے سے ہوتی ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اگر یہ آپ کی حالت ہے تو کس نے آپ کو مشورہ دیا کہ آپ ہماری اس جماعت میں تشریف لائیں؟ یہ جماعت تو بنی ہی اس اصول پر ہے کہ سب عقیدتوں کو ختم کر کے صرف ایک خدا اور اس کے رسول اور اس کے دین کی عقیدت باقی رکھی جائے۔ اور اس کے بعد اگر کوئی عقیدت ہو تو وہ اس اصلی عقیدت کے تابع ہونی چاہیے نہ کہ اس کی مدِ مقابل۔ لیکن اگر آپ ابھی تک ان عقیدتوں میں مبتلا ہیں جو اس اصلی اور حقیقی عقیدت کی مدِ مقابل بن سکتی ہیں تو آپ کا مقام ہماری جماعت کے اندر نہیں بلکہ اس کے باہر ہے۔

(۳) میں نے آپ کی کارروائیوں کی رپوٹوں میں تعلیم بالغان کا ذکر بہت کم سنا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اس کی اہمیت آپ پر کس طرح واضح کروں۔ اول تو میرے پاس کوئی زور نہیں ہے، اور اگر زور ہو بھی تو یہ کام ایسا نہیں ہے کہ بزور کسی سے لیا جا سکے۔ یہ تو ایک رضاکارانہ خدمت ہے اور صرف اسی طرح یہ ہو سکتی ہے کہ آپ خود اس کی پوری اہمیت کو محسوس کریں اور اپنے دلی جذبے کے ساتھ اسے کرنے کی کوشش کریں۔ اس کی مصلحتوں اور فائدوں کا ذکر میں اس سے پہلے کر چکا ہوں۔ اس کی ضرورت بھی میں نے آپکے سامنے واضح کر دی ہے۔ اب آپ میں سے جو لوگ تعلیم یافتہ ہیں وہ اس طرح سوچنا شروع کریں کہ انھوں نے اپنا کتنا وقت اور اپنی دماغی قابلیتوں اور جسمانی قوتوں کا کتنا حصہ اپنے نفس کی پرورش میں لگا رکھا ہے اور کتنا خدا کے کام کے لیے دیا ہے۔ اس کا حساب لگا کر اگر آپ دیکھیں گے تو جلدی ہی آپ پر منکشف ہو جائے گا کہ آپ نے سب سے کم حصہ خدا کو دے رکھا ہے حالانکہ عقیدہ آپ کا یہ ہے کہ سب کچھ اسی کا ہے۔ اس کے بعد اگر واقعی آپ کا دل اس بات پر آمادہ ہو کہ خدا کا حق بھی کچھ ادا کرنا چاہیے تو اس کا حق ادا کرنے کی کم سے کم صورت یہ ہے کہ اس کے جو بندے غفلت اور جہالت اور اخلاقی پستی میں پڑے ہوئے ہیں ان کو سدھارنے کے لیے آپ اپنے وقت کا ایک حصہ مستقل طور پر وقف کر دیں۔

(۴) بعض لوگوں نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ ہمارے مسلک کو سمجھنا عوام کے لیے مشکل ہے۔ یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس دین کو ابتدا میں عرب کے صحرانشین بدوؤں نے اور ان پڑھ لوگوں نے سمجھا تھا جو کسی کتاب کا علم نہ رکھتے تھے۔ انھوں نے اس کو صرف سمجھا ہی نہیں بلکہ وہ اس کی گہرائیوں تک میں اتر گئے اور ان سے جن لوگوں نے اس کی تعلیم حاصل کی وہ دنیا کے معلم بن کر رہے۔ پھر یہ شبہ آپ کو کیسے ہوتا ہے کہ آج ہندوستان کے کسان اور مزدور اور عام باشندے اسے نہ سمجھ سکیں گے؟ میرا اپنا تجربہ تو یہ ہے کہ جن لوگوں نے کتابی علوم پڑھے ہیں ان کے دماغوں میں تو ضرور ایسے پیچ پڑ جاتے ہیں، جن کی وجہ سے

اس دین کی سیدھی سادی باتیں بھی ان کے اندر اتر تی مشکل ہوتی ہیں اور اسی وجہ سے ان کو سمجھانے کے لیے ہمیں لمبی چوڑی علمی بحثیں کرنی پڑتی ہیں، لیکن عامۃ الناس جن کے دماغ ایک بڑی حد تک اپنی فطری حالت پر ہیں اس دین کو بڑی آسانی سے سمجھ لیتے ہیں بشرطیکہ سمجھانے والا عام فہم اندازِ بیان اختیار کرے اور اس کے ساتھ اس کی اپنی زندگی اس بات کی شہادت دے کر وہ جن چیزوں کو پیش کر رہا ہے فی الواقع وہ خود بھی ان پر ایمان رکھتا ہے۔ عوام کو آپ کی بات سمجھنے میں اگر کوئی الجھن پیش آسکتی ہے تو وہ صرف دو وجوہ سے پیش آسکتی ہے۔ ایک یہ کہ آپ ان کے سامنے اس طرح کی باتیں کریں جیسی کسی عربی مدرسے کے طالب علم یا کسی کالج کے لڑکوں کے سامنے کی جاتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ آپ خود کچھ اور ہوں اور باتیں کچھ اور کریں۔ ان دو خامیوں سے اگر آپ کی تبلیغ پاک ہو جائے تو آپ دیکھ لیں گے کہ عوام اس دین کو کس طرح آسانی سے سمجھتے ہیں۔

(۵) بعض لوگوں نے شکایت کی ہے کہ جب ہم عام لوگوں میں اصلاح و تبلیغ کی کوشش کرتے ہیں تو کوئی فتنہ پرداز شخص اٹھ کر کہہ دیتا ہے کہ یہ لوگ "وہابی" ہیں اور اس کے بعد کوئی ہماری بات سننے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ یہ شکایت جن حضرات نے پیش کی ہے وہ غالباً اس چیز کو اپنی راہ میں بڑی رکاوٹ سمجھ رہے ہیں۔ حالانکہ اگر اس لفظ وہابی کی تاریخ اور پروپیگنڈے کے اس ہتھکنڈے کو سمجھ لیا جائے جس سے یہ لفظ پیدا ہوا ہے تو بڑی آسانی سے اس کا توڑ معلوم کیا جا سکتا ہے۔ دراصل انیسویں صدی میں کچھ سیاسی اسباب سے مصر اور ترکی کی مسلمان اور ہندوستان کی غیر مسلم حکومت نے اُن اصلاحی تحریکوں کو جو ہندوستان اور عرب میں اٹھی تھیں دبانے کے لیے یہ وہابی کا لفظ ایجاد کیا تھا۔ پروپیگنڈا کے کارگر نسخوں میں سے ایک یہ ہے کہ جس گروہ کو آپ زک پہنچانا چاہیں اسے پہلے ایک نام دیجیے، اور تمام برائیاں جو اس کی طرف منسوب کرنا چاہتے ہوں ان سب کے معنی اس خاص نام میں پیدا کر دیجیے۔ پھر اس نام کا اتنا اشتہار کیجیے کہ جہاں وہ نام لیا گیا اور فوراً سننے والوں کے سامنے ان ساری برائیوں کی تصویر آجائے جو آپ نے اس نام کے ساتھ وابستہ کر دی ہیں۔ اس طرح لمبی چوڑی تقریروں اور تحریروں کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی بلکہ ان سب کی جگہ صرف ایک لفظ زبان سے نکال دینے سے کام چل جاتا ہے۔ موجودہ زمانے میں مختلف جماعتوں نے اپنے پروپیگنڈا کے لیے اس طریقے کو استعمال کیا ہے۔ مُلّا، ٹوڈی، رجعت پسند، بورژوا اور اسی طرح کے دوسرے الفاظ اسی غرض کے لیے وضع کیے گئے ہیں، اور ان سے خوب کام لیا گیا ہے۔ ایسا ہی ایک ہتھیار لفظ وہابی بھی ہے جسے ابتدا میں بعض خود غرض حکومتوں نے سیاسی مقاصد کے لیے ایجاد کیا اور پھر مسلمانوں کے ان تمام گروہوں نے اس سے فائدہ اٹھانا شروع کر دیا جو عوام میں کسی قسم کی دینی بیداری پیدا ہونے کو اپنی دنیوی اغراض کے لیے نقصان دہ سمجھتے ہیں۔ اب اس کا علاج یہ نہیں ہے کہ آپ اپنے وہابی ہونے کی تردید کرتے پھریں اور نہ یہی درست ہے کہ جہاں آپ کے خلاف یہ ہتھیار استعمال کیا جائے وہاں سے آپ شکست کھا کر پسپائی اختیار کر لیں، بلکہ اس کا علاج صرف یہ ہے کہ آپ سیدھے سیدھے ایک مسلمان کی سی زندگی بسر کرتے رہیں اور خلقِ خدا کو توحید خالص اور قرآن و سنت کے اتباع کی دعوت دیتے رہیں، اور جو لوگ آپ کو وہابی کہتے ہیں ان کو چھوڑ دیں کہ وہ اسی نام کی تسبیح پڑھتے رہیں۔ اس کا نتیجہ بالآخر یہ ہوگا کہ رفتہ رفتہ آپ کے طرزِ عمل اور ان لوگوں کے اشتہارِ وہابیت سے مل جل کر لفظ وہابی میں ایک اور معنی پیدا ہو جائیں گے اور وہ یہ کہ وہابی اسے کہتے ہیں جو سیدھی سادی مسلمان کی سی زندگی بسر کرتا ہو، کسی سے جھگڑا اور بحث و مناظرہ نہ کرتا ہو، پاکیزہ اخلاق اور نیک معاملات رکھتا ہو، اور عقیدہ توحید اور اتباع

قرآن و سنت کی دعوت دیتا ہو۔ اس کے بعد جو شخص فی الواقع انہی چیزوں کا طالب ہو گا جو آپ کے پاس اسے ملتی ہیں اس کو تو وہابیت کا نام آپ کی طرف آنے سے روکے گا نہیں بلکہ الٹا آپ کی طرف کھینچے گا اور وہ زمین میں "وہابیوں" ہی کو ڈھونڈتا پھرے گا۔ رہے وہ لوگ جو بجائے خود اسلام ہی کو اس کی حقیقی صورت میں پسند نہیں کرتے تو وہ ضرور آپ سے دور بھاگیں گے لیکن آپ کو افسوس نہ کرنا چاہیے اگر ایسے حق سے پھرے ہوئے لوگ آپ سے دور بھاگیں۔

تجاویز

اس کے بعد وہ تجاویز پیش ہوئیں جو مختلف جماعتوں اور ارکان کی طرف سے آئی تھیں۔ امیر جماعت نے خود ہر تجویز کو پڑھ کر سنایا، اس کے بعد مختصر الفاظ میں اس کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کیا اور مجوزین کو موقع دیا کہ اگر وہ ان کے جواب سے مطمئن نہ ہوں تو اپنی تجویز کے متعلق خود اپنا نقطۂ نظر پیش کریں لیکن اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی کسی نے ضرورت محسوس نہیں کی۔ ذیل میں تجاویز کا خلاصہ نمبروار درج کیا جاتا ہے اور ہر تجویز کے بعد جس رائے کا اظہار امیر جماعت نے کیا وہ بھی ساتھ ساتھ درج ہے:

تجویز نمبر ۱: مجوزہ تعلیمی درسگاہ کا جلدی سے جلدی اجرا کیا جائے۔ اگر جنگی حالات کی وجہ سے مستقل عمارات نہ بن سکتی ہوں تو عارضی عمارات ہی بنا کر کام شروع کر دیا جائے۔

امیر جماعت: رات مجلس شوریٰ میں اس پر غور کیا گیا ہے۔ چونکہ عارضی ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے زیادہ عمارات کی ضرورت نہیں ہے اور موجودہ عمارات ہی تھوڑے تغیر اور اضافے سے اس کے لیے کافی ہو سکتی ہیں اس لیے فیصلہ کیا گیا ہے کہ اس کام کو جلدی سے جلدی شروع کر دیا جائے۔ رہی ابتدائی تعلیم تو اس کی تیاری کی جاتی رہے گی، لیکن شائد اس کے شروع کرنے میں ابھی دیر لگے گی۔ عارضی عمارات بنانے میں بھی جو دقتیں ہیں وہ بآسانی دور نہیں کی جا سکتیں۔

تجویز نمبر ۲: تعلیم یافتہ ارکانِ جماعت کے لیے ایک تربیت گاہ کا انتظام کیا جائے۔

امیر جماعت: جس ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کا انتظام اب ہم شروع کرنے والے ہیں اس کے پروگرام میں تربیت گاہ بھی شامل ہے۔

تجویز نمبر ۳: ائمۂ مساجد اور دیہاتی پرائمری مدارس کے لیے مدرسین اور دیہات میں کام کرنے والے مبلغین کا انتظام کیا جائے۔

امیر جماعت: جہاں تک نفس اُس ضرورت کا تعلق ہے جس کا اظہار آپ کی اس تجویز سے ہو رہا ہے، اس کو ہماری ثانوی اور اعلیٰ تعلیم پورا کر دے گی۔ لیکن میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ اس تجویز کے پیچھے کچھ اُس شور و شغب کے اثرات بھی کام کر رہے ہیں جو "ائمۂ مساجد کی ٹریننگ" اور "مبلغین کی تیاری" اور "مدرسین دینیات کی تربیت" اور اسی قسم کے دوسرے عنوانات پر پچھلے چند سال سے برپا ہے۔ ہمارے ملک میں ایک اچھا خاصا گروہ ایسے لوگوں کا بھی پایا جاتا ہے جو اصلاح احوال کی ضرورت کا احساس تو رکھتے ہیں مگر اتنی بصیرت نہیں رکھتے کہ احوال کی اصل خرابی کو سمجھ سکیں اور انھیں درست کرنے کی صحیح تدابیر معلوم کر سکیں۔ یہ لوگ سطحی طور پر چند خرابیوں کو دیکھ کر سمجھتے ہیں کہ بس یہی اصل بیماریاں ہیں اور ان کے علاج کے لیے چند سستے نسخے تجویز کر کے ان کا اشتہار دینا شروع کر دیتے ہیں۔ پھر جب کچھ مدت تک یہ اشتہارات فضا میں گونجتے رہتے ہیں تو دماغوں پر ان کا کچھ ایسا تسلط ہو جاتا ہے کہ جہاں کسی نے اصلاح احوال کا تصور کیا اور بے ساختہ اس کی زبان پر "ائمۂ مساجد کی ٹریننگ" اور "مبلغین کی تیاری" اور ایسے ہی

کچھ دوسرے فقرے جاری ہونے لگتے ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ شاید آپ حضرات بھی وقت کے ان چلتے ہوئے اشتہارات سے متاثر ہو گئے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو ذہن کو "اشتہار پروف" بنانے کی کوشش کیجیے۔ سوچیے تو سہی کہ آخر ائمہ مساجد کس لیے تیار کیے جائیں؟ کیا آپ کا گمان ہے کہ مسجدوں پر نالائق پیش نمازوں کا قبضہ صرف اس وجہ سے ہے کہ لائق امام نہیں ملتے ورنہ اگر اچھے اماموں کی فراہمی کا انتظام ہو جائے تو سارے ملک کی مسجدیں ہاتھوں ہاتھ ان کو لیں گی اور دیکھتے دیکھتے ہر مسجد مسلم سوسائٹی کا دھڑکتا ہوا دل بن جائے گی؟ اگر بات صرف اتنی ہی ہوتی تو پھر رونا کاہے کا تھا۔ لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ نالائق امام مسجدوں میں خود نہیں آئے ہیں بلکہ مسلمان ان کو لائے ہیں۔ مسلمانوں کو دراصل وہ لوگ مطلوب ہی نہیں ہیں جو بستیوں میں ان کے واقعی امام بن کر رہیں اور مسجدوں کو اسلامی زندگی کا مرکز بنا کر رکھیں۔ ان کا بگڑا ہوا مذاق، ان کی دینی بے حسی ان کی اخلاقی پستی، ان کا دنیا میں استغراق اور خدا کے ساتھ ان کا منافقانہ رویہ صرف ایسے امام پسند کرتا ہے جو بستیوں کے پیشہ ور "کمینوں" کی طرح ایک قسم کے "کمین" بن کر ان کی مسجدوں میں رہیں اور ان کی دی ہوئی روٹیاں کھا کر پیش نمازی کا کام بس اس طرح انجام دیا کریں جس طرح وہ ان سے لینا چاہتے ہیں۔ پس خرابی یہ نہیں ہے کہ جسم (یعنی مسلم سوسائٹی) زندہ ہے مگر کسی حادثہ سے اس کے دل (یعنی مسجد) پر جمود و سکون طاری ہو گیا ہے۔ بلکہ حقیقی خرابی یہ ہے کہ جسم خود ٹھنڈا ہو گیا ہے اور اس نے بالآخر دل کو ٹھنڈا کر کے چھوڑا ہے۔ اب اگر آپ کے پیش نظر یہ ہے کہ جیسے تنخواہ دار امام و خطیب یہ بگڑی ... ہوئی سوسائٹی مانگتی ہے ویسے ہی آپ تیار کرنا شروع کر دیں اور جہاں جہاں سے ان کی مانگ آئے وہاں نان و نفقہ کا معاملہ طے کر کے ان کو بھیج دیا کریں تو "اس پیشۂ امامت" کا سکھانا اور اس کے لیے کچھ اہل حرفہ کو تیار کرنا ہمارے بس کا کام نہیں ہے۔ اور اگر آپ وہ حقیقی امام بنانا چاہتے ہیں جو ایک زندہ مسلم سوسائٹی کو درکار ہوتے ہیں تو جب وہ زندہ سوسائٹی موجود نہ ہو اس کے لیے امام تیار کرنا ایسا ہے جیسے دولہا کو تیار کر دیا جائے درانحالیکہ دلہن ابھی بطن مادر میں بھی نہ آئی ہو۔ ہم اپنی درسگاہ میں جن لوگوں کو تیار کریں گے ان کا اصل کام ایک زندہ مسلم سوسائٹی کو پیدا کرنا ہو گا، پھر جیسے جیسے ان کی دعوت سے ایسی سوسائٹی وجود میں آتی جائے گی، یہی داعی فطری طور پر اس کے لیڈر (امام) بنتے جائیں گے اور جن مسجدوں کو وہ اپنا قلب متحرک بنائے گی ان کے امام اور پوری بستی کے دینی، اخلاقی اور اجتماعی اور سیاسی پیشوا یہی لوگ قرار پائیں گے۔

ایسی ہی کچھ غلط فہمی مدرسین کی تیاری کے معاملہ میں بھی آپ کو ہوئی ہے۔ واقعہ یہ نہیں ہے کہ لوگ حقیقی اسلامی تعلیم کے خواہشمند ہیں اور کمی صرف مدرسین کی ہے۔ بلکہ اصل مصیبت یہ ہے کہ لوگوں کے اندر حقیقی اسلامی تعلیم کی طلب ہی نہیں ہے۔ وہ جس چیز کی طلب رکھتے ہیں اگر اسی کو اجرت پر فراہم کرنے کے لیے آپ تعلیمی مزدور تیار کرنا چاہتے ہیں تو یہ خدمت انجام دینا ہمارا کام نہیں ہے، اور اگر آپ کے پیش نظر وہ تعلیم تیار کرنا ہے جو اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق آئندہ نسلوں کو ڈھال سکتے ہوں تو اس جنس کی فراہمی کا انتظام کرنے سے پہلے منڈی میں اصلی مانگ پیدا کیجیے۔ اسی طرح مبلغین کی تیاری کا مفہوم بھی غالباً آپ کے ذہن میں واضح نہیں ہے۔ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ کچھ لوگوں کو تبلیغ کا فن اس لیے سکھایا جائے کہ ملک کے مختلف انجمنوں کو جس قسم کے پیشہ ور تنخواہ دار مبلغ درکار ہیں وہ یہاں سے فراہم کیے جائیں؟ اگر یہ آپ کا مقصد نہیں ہے تو مبلغین کی تیاری کے لیے ایک مستقل تجویز کی کیا ضرورت ہے؟ ہماری درسگاہ میں جو تعلیم لوگوں کو دی جائے گی اور جو دینی روح ان کے اندر پھونکی جائے گی وہ اس غرض کے لیے بالکل کافی ہوگی کہ یہ لوگ جہاں بھی آ جائیں

اور جو کام بھی کریں اپنے اخلاق سے، اپنے معاملات سے، اپنی گفتار سے، اپنی رفتار سے، ہر چیز سے دینِ حق کی تبلیغ کرتے رہیں۔

تجویز نمبر۴: ارکان اپنی اور اپنے بچوں کی شادیاں صرف دیندار لڑکی یا لڑکے سے کریں۔

امیرِ جماعت: یہ ایسی چیز نہیں ہے جسے تجویز کی حیثیت سے پیش کیا جائے۔ یہ تو حقیقی دینی شعور پیدا ہو جانے کا لازمی اور اس کا فطری نتیجہ ہے۔ جب آدمی میں بھی یہ شعور پیدا ہو جائے گا وہ لازماً دین سے پھرے ہوئے اور اخلاقی حیثیت سے گرے ہوئے لوگوں کو شادی بیاہ کے تعلق کے لیے تو درکنار دوستی و ہم نشینی کے لیے بھی پسند نہ کرے گا۔ اور اگر کوئی شخص ایسا ہے جو دینی شعور رکھنے کا دعویٰ کرتا ہے مگر شادی بیاہ کے لیے دین و اخلاق کو دیکھنے کے بجائے مال و دولت اور دنیوی وجاہت کا لحاظ کرتا ہے تو اس کا دعویٰ یا تو فریب ہے یا پھر ایک غلط فہمی ہے جو اسے اپنی نسبت ہو گئی ہے۔ ایسے لوگ اگر خدانخواستہ ہماری جماعت میں پائے جائیں تو انہیں ضرور مطلع کر دینا چاہیے کہ آپ کے لیے یہاں کوئی جگہ نہیں ہے کیونکہ آپ کی یہ حرکت اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ آپ کے اندر شعور کی کمی ہے۔ اور آپ کا معیارِ قدر و قیمت ابھی تک دنیا پرستانہ ہی ہے۔ پس جو چیز بجائے خود دینی حس کی مقیاس ہے اسے یہاں ایک تجویز کی شکل میں پیش کرنا اور پھر ایک جماعتی فیصلے کی صورت میں نافذ کرنا میرے نزدیک ٹھیک ایسا ہے جیسے کل ہم اپنے اجتماع میں یہ تجویز پاس کریں کہ سب ارکانِ جماعت نماز پڑھیں۔ جس طرح ہم ارکانِ جماعت کے دینی شعور سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ خود اپنے احساسِ فرض کی بنا پر نماز پڑھیں گے نہ کہ کسی جماعتی تجویز کی بنا پر اسی طرح ہم ان سے یہ بھی توقع رکھتے ہیں کہ ان کے نزدیک رشتہ داریوں اور دوستیوں اور تمام تعلقات میں دینداری و طہارتِ اخلاق کا لحاظ دوسرے سب ملحوظات پر مقدم ہوگا۔

تجویز نمبر۵: ہر رکن کو جسمانی مشقتیں برداشت کرنے کا خوگر بنانے کے لیے ضروری ہدایات دی جائیں۔

امیرِ جماعت: اگر اس کا منشا یہ ہے کہ جماعت میں پریڈ اور ورزش کا انتظام کیا جائے اور فنونِ سپہ گری سکھانے کے لیے اکھاڑے قائم کیے جائیں تو یہ ہمارے طریقِ کار کے بالکل خلاف ہے۔ اور اگر اس سے مقصود یہ ہے کہ لوگوں کو مصنوعی طور پر کچھ جفاکشی کے طریقے اختیار کرنے کا حکم دیا جائے تو یہ ایک فضول بات ہے۔ اس اصولی حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ زندگی میں بے شمار چیزیں ایسی ہیں جن کی ضرورت پیش آتی ہے لیکن اگر ان میں سے ہر ایک کو لے کر مقصود بالذات بنایا جائے اور ایک ایک کے لیے لوگوں کو اکسا کر جدا جدا انتظامات کیے جائیں تو اس طرح نہ صرف یہ کہ کوششیں منتشر ہو جائیں گی بلکہ فی الواقع ان بے شمار چھوٹے چھوٹے مقاصد سے بھی کسی مقصد کے ساتھ لوگوں کی دلچسپی اور وابستگی زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکے گی۔ برعکس اس کے اگر لوگوں کی نظریں کسی ایک بلند نصب العین پر جما دی جائیں اور اس کا عشق لوگوں کے دلوں میں بھڑکا دیا جائے تو پھر لوگ ہر اس چیز کے لیے کام کرنے لگیں گے جس کی اس نصب العین کے لیے ان کو ضرورت محسوس ہوگی اور مختلف کاموں کے لیے ان کو الگ الگ اکسانے کی کوئی ضرورت نہ رہے گی۔ جو نصب العین اس وقت ہم نے بندگانِ خدا کے سامنے پیش کیا ہے اور جس کی کشش سے آپ لوگ کھنچ کر آئے ہیں بس ساری کوشش اسی کا عشق اپنے دلوں میں اور دوسرے لوگوں کے دلوں میں بھڑکانے پر صرف کر دیجیے۔ پھر اگر اس کے لیے جسمانی قوت بہم پہنچانے کی ضرورت محسوس ہوگی تو اس کا انتظام اپنے وقت پر خود بخود ہو گا۔ اگر وہ جفاکشی کا طالب ہوگا تو نازوں کے پالے ہوئے لوگ آپ سے آپ اس کے عشق میں مشقتیں سہنے لگیں گے۔ اور اگر کسی صنعت کے اجزاء

یا کسی فن کی تحصیل کا مطالبہ کرے گا تو لوگ دلی شوق کے ساتھ اس کی طرف دوڑیں گے۔ ان میں سے کسی کام کے لیے بھی کسی مستقل تحریک کی حاجت پیش نہ آئے گی بلکہ تحریک کا ارتقاء فطری طور پر ہر مرحلے میں اپنی ضروریات آپ پر خود ہی واضح بھی کر دے گا اور خود ہی آپ کو مجبور کر کے انہیں پورا بھی کرے گا۔ لیکن اگر ہم کسی چیز کا وقت آنے سے پہلے، تحریک کے اندر اس کی مانگ پیدا ہونے اور اس کی ضرورت کا احساس ابھرنے سے پہلے مصنوعی طور پر اس کے لیے تحریک کریں گے تو نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ ہوگا کہ محض ایک کام شروع کیا جائے گا، چند دنوں تک اسے نیم دلی اور بد دلی کے ساتھ کیا جاتا رہے گا اور پھر رفتہ رفتہ وہ ختم ہو جائیگا۔

تجویز نمبر ۶ : ہندوستان کے تمام اطراف میں تحریک کی اشاعت کے لیے ترجمان اور مکتبہ جماعت کے رجسٹروں سے ان لوگوں کی ضلع وار فہرستیں بنائی جائیں جن تک لٹریچر پہنچ چکا ہے اور پھر ہر مقام کی جماعت کو اس کے ضلع کی یا اس پاس کے اضلاع کی فہرست بہم پہنچانے کا انتظام کیا جائے۔

امیر جماعت : ایک عرصہ سے میں خود اس ضرورت کو محسوس کر رہا ہوں لیکن مکتبے اور ترجمان کا اسٹاف اتنا کم ہے کہ اس پر فہرست بنانے کا بار نہیں ڈالا جا سکتا۔ اگر ارکان جماعت میں سے دو تین حضرات چند روز کے لیے یہاں ٹھہر جائیں تو یہ ضرورت بآسانی پوری ہو سکتی ہے۔

نوٹ :۔ اس اپیل پر چند صاحبوں نے اپنی خدمات پیش کیں جن میں سے دو صاحبوں کو یہاں روک لیا گیا۔ شمالی ہند کی فہرست تقریباً تیار ہو چکی ہے۔

تجویز ۷ : لٹریچر کا انگریزی اور دوسری ملکی زبانوں میں ترجمہ ہونا چاہیے۔ نیز ترجمان کا ایک حصہ یا ایک مستقل رسالہ انگریزی میں نکالا جائے۔

امیر جماعت : بلاشبہ یہ ضرورت اہم ہے مگر انگریزی زبان کے لیے اب تک ہمیں کوئی موزوں آدمی نہیں ملا ہے۔ دوسری زبانوں کے لیے کچھ نہ کچھ انتظام ہو رہا ہے جس کی کیفیت آپ کو قیم جماعت کی رپورٹ سے معلوم ہو چکی ہے۔

تجویز ۸ : عورتوں اور بچوں کے لیے آسان لٹریچر تیار کیا جائے۔

امیر جماعت : جہاں تک بچوں کے لٹریچر کا تعلق ہے یہ ضرورت ایک بڑی حد تک ہمارے ابتدائی تعلیم کے نصاب سے پوری ہو جائے گی۔ البتہ عورتوں کا سوال خاص اہمیت رکھتا ہے اور اس کے لیے ہمیں خود عورتوں ہی کا تعاون حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ ارکان جماعت کو خاص طور پر اس طرف توجہ کرنی چاہیے کہ خود اپنے خاندان کی خواتین کو ہم خیال بنائیں۔ انشاء اللہ انہی میں سے کچھ اس قابلیت کی خواتین نکل آئیں گی جو اپنی ہم جنسوں میں اس دعوت کو پھیلانے کے لیے مفید کام کر سکیں گی۔

تجویز نمبر ۹ : صحیح اسلامی تاریخ کی ترتیب۔

امیر جماعت : یہ ہماری مجلس تحقیقات علمیہ (Accadamy) کے پروگرام میں شامل ہے جسے اپنی درسگاہ کی اسکیم کو شروع کرنے کے بعد ہی انشاء اللہ ہم عملی جامہ پہنائیں گے۔

تجویز نمبر ۱۰ : عوام اور غیر مسلموں میں اشاعت کے لیے آسان لٹریچر کی فراہمی نیز دیہاتیوں سے ربط پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

امیر جماعت :۔ بلاشبہ عوام اور غیر مسلموں کے لیے ہمارے لٹریچر میں اب تک بہت کم چیزیں ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت تک لٹریچر تیار کرنے کا سارا کام ایک ہی شخص کرتا رہا ہے جو مخصوص تعلیم یافتہ طبقوں کے لیے ہی لکھنے کی

صلاحیت رکھتا ہے۔ اب ضرورت ہے کہ جماعت میں جو لوگ انشاء پردازی کی قابلیت رکھتے ہیں وہ اپنا جائزہ لے کر خود اندازہ کریں کہ وہ کس طبقے کے لوگوں کے لیے کس قسم کی چیزیں لکھ سکتے ہیں، اور عملاً اپنی قوتوں کو اس کام میں استعمال کرنا شروع کردیں۔ جہاں تک اشاعت کا تعلق ہے ایسی چیزوں کو تو ہمارا مکتبہ خود شائع کرسکتا ہے جو براہِ راست جماعتی لٹریچر قرار پاسکتی ہوں، رہیں وہ ضمنی چیزیں جو ہماری دعوت سے کسی نہ کسی طرح کا قریبی تعلق رکھتی ہوں تو ان کی اشاعت کے لیے ارکانِ جماعت آپس میں مل کر مختلف مقامات پر اپنے دارالاشاعت قائم کرسکتے ہیں یا ان دارالاشاعتوں سے تعلق پیدا کرسکتے ہیں جو پہلے سے بعض ارکان نے قائم کر رکھے ہیں۔

عوام سے ربط قائم کرنے کے لیے بہترین صورت وہی ہے جو میں نے تعلیم بالغاں کی شکل میں پیش کی ہے۔ رہا دیہات میں کام کرنے کا سوال تو اس کے متعلق میں اس سے پہلے کئی مواقع پر کہہ بھی چکا ہوں اور لکھ بھی چکا ہوں کہ یہ کام صرف ان لوگوں کو کرنا چاہیے جو اس کی صلاحیت رکھتے ہوں اور اس سے زیادہ قیمتی کام نہ کرسکتے ہوں۔ ہر کس و ناکس کا اٹھ کر سیدھا دیہات کا رخ کرنا محض ایک نادانی ہے اور وقت کی چلتی ہوئی رَو کے پیچھے دوڑنا۔ اسی طرح جو شخص دیہات میں چکر لگانے سے بدرجہا قیمتی کام کسی دوسری شکل میں کرسکتا ہو اس کا محض اس لیے دیہات کی طرف رخ کرنا کہ آجکل اس کام نے کچھ قبولیتِ عام حاصل کرلی ہے اپنی قوتوں کا بے جا استعمال ہے اور اس پر خدا کے ہاں اجر ملنے کے بجائے بازپرس ہونے کا خطرہ ہے۔ البتہ جو لوگ دیہاتی آبادی سے خطاب کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں اور جن کو اس کام سے پیدائشی مناسبت ہے انھیں اس طرف ضرور توجہ کرنی چاہیے۔ لیکن اس کے لیے صحیح طریقہ یہ نہیں ہے کہ ایک پارٹی اٹھے اور چند روز کے اندر ایک سرے سے لیکر دوسرے سرے تک بہت سے دیہات کا چکر لگا آجائے، بلکہ اس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ ایک گاؤں کو انتخاب کیجیے اور اس میں ایک کافی مدت تک مسلسل کام کرتے رہیے یہاں تک کہ چند آدمی وہاں آپ کے پختہ ہم خیال، اخلاقی حیثیت سے کافی حد تک تبدیل شدہ اور ہماری تحریک کے کارکن بننے کے لیے موزوں تیار ہوجائیں، پھر ان کو خود ان کی بستی میں اصلاح و دعوت کا کام اسی طریقے پر کرنے کے لیے استعمال کیجیے۔

نوٹ:۔ تعلیم بالغاں کے لیے نصاب مرتب کرنے اور ملک کے دوسرے اداروں کے مرتب کردہ نصابوں میں سے مفید چیزیں انتخاب کرنے کی خدمت محمد شفیع صاحب (مدرسہ ابتدائی رجبن بازار میرٹھ) اور سید نقی علی صاحب (صدر مدرس کورٹلم براہ ڈچ پلی این، ایس، آر دکن) نے اپنے ذمہ لی ہے۔ اب جو لوگ اس سلسلے میں کام کرنا چاہیں وہ ان حضرات سے براہِ راست مراسلت کرکے مشورہ حاصل کریں۔

تجویز نمبر ۱۱: بعض مقامات پر ذیلی مراکز قائم کرنے کی تجویزیں۔

امیر جماعت: اگر ابھی کچھ مدت ذیلی مرکزوں کو ملتوی رکھا جائے تو زیادہ بہتر رہے گا، اس لیے کہ سردست ہمیں اپنی جماعت کی تمام قوت اور اپنے سارے وسائل اور مردان کار جمع کرکے اصل مرکز کو طاقتور بنالینا چاہیے، پھر جتنے بھی ذیلی مرکز ملک کے مختلف گوشوں میں بنیں گے ان شاء اللہ وہ ہمارے لیے مفید ثابت ہوں گے اور ان سے مرکز کو اور مرکز سے ان کو تقویت پہنچے گی۔ لیکن اگر اس وقت ہمارے ارکان اور ہماری بیرونی جماعتیں ذیلی مراکز بنانے کی طرف توجہ کریں گی تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہماری قوتیں منتشر ہوجائیں گی، نہ اصل مرکز ہی بن سکے گا اور نہ ذیلی مراکز ہی کوئی مفید صورت اختیار کرسکیں گے۔ اس سے میرا یہ مدعا نہیں ہے کہ آپ لوگ جہاں جہاں ذیلی مراکز قائم کرنے کے امکانات اور مواقع پاتے ہیں ان پر غور کرنا بھی چھوڑ دیں۔ بہتر ہے کہ تمام پہلو آپ کے سامنے

رہیں اور جب ذیلی مراکز قائم کرنے کا موقع آئے تو سوچی سمجھی سکیمیں آپ کے پاس تیار رہوں۔

تجویز نمبر ۱۲ : مرکز کسی مرکزی جگہ پر ہونا چاہیے۔

امیر جماعت : مرکزی جگہ تو وہی ہوتی ہے جہاں مرکز ہو۔ اب اس سوال کو چھوڑ ہی دیا جائے تو بہتر ہے۔ جب ایک مرتبہ سر جوڑ کر ہم فیصلہ کر چکے ہیں کہ ہمیں یہیں بیٹھ کر کام کرنا ہے تو اس سوال کو بار بار اٹھانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اس کے علاوہ ہمیں تجربے سے یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ اکثر اس قسم کی تجویزیں محض خواہش کی شکل میں آتی ہیں حالانکہ خواہش میں نہ آدمی رہ سکتے ہیں نہ بک ڈپو رکھا جا سکتا ہے اور نہ پریس نصب کیا جا سکتا ہے۔ ان چیزوں کے لیے تو جگہ اور مکانات چاہئیں۔ وہ یہاں کسی نہ کسی حد تک موجود تو ہیں۔

تجویز نمبر ۱۳ : عورتوں میں ترقی تحریک کی عملی اسکیم بنائی جائے اور اس کے لیے ہدایات دی جائیں۔

امیر جماعت : فی الواقع ہمارے لیے یہ سوال بہت اہم ہے کہ عورتوں کو کس طرح اپنے ساتھ لیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ جب تک عورتیں ہمارے ساتھ نہ ہوں پچاس فی صدی آبادی مستقل طور پر ہم سے غیر متعلق رہے گی اور وہ پچاس فی صدی آبادی بھی وہ ہوگی جس کی گود میں بقیہ پچاس فی صدی آبادی تیار ہوتی ہے۔ لہٰذا ہماری تحریک کی ترقی کے لیے عورتوں کا اس میں شامل ہونا اتنا ہی ضروری ہے جتنا مردوں کا شامل ہونا۔ لیکن ہمارے لیے یہ کام اتنا سہل نہیں ہے جتنا دوسری تحریکوں کے لیے ہے دوسری تحریکیں تو عورتوں کو آزادی کا سبق پڑھا کر گھروں سے باہر نکال لاتی ہیں اور انھیں مردوں کے دوش بدوش دوڑ دھوپ کرنے کے لیے تیار کر لیتی ہیں۔ لیکن ہمیں جو کچھ کرنا ہے اسلامی اصولوں کی پابندی کرتے ہوئے ان حدود کے اندر کرنا ہے جو شریعت نے مقرر کیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کو بحالت موجودہ اس معاملے میں مشکلات سے سابقہ پیش آرہا ہے۔ سردست میرے نزدیک عورتوں میں اس تحریک کو پھیلانے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں ہے کہ ہمارے رفقاء اور ہمدرد خود اپنی ماؤں، اور بہنوں بیٹیوں، اور اپنے خاندان کی دوسری خواتین میں اپنے خیالات پھیلائیں، اپنے عملی اخلاق سے ان کو متاثر کریں، ان میں جو تعلیم یافتہ ہوں ان کو لٹریچر پڑھوائیں۔ اور جو تعلیم یافتہ نہ ہوں ان کو خود تعلیم دیں۔ اس طرح جب ایک کافی مدت تک کوشش کی جائے گی اور اس کے نتیجے میں جب عورتوں کی ایک کافی تعداد ہماری ہم خیال بن جائے گی تب یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ خود عورتوں ہی میں ایسی کارکن خواتین ہمیں مل جائیں گی جو دوسرے گھروں تک ہمارے خیالات اور اخلاقی اثرات پھیلا سکیں گی۔ لیکن اس معاملے میں خاص طور پر یہ احتیاط ملحوظ رکھی جائے۔ کہ ارکان جماعت اپنی بیویوں کو صرف اس وجہ سے جماعت میں داخل نہ کریں کہ وہ ان کی بیویاں ہیں۔ اس تحریک کے معاملہ میں شوہرانہ قوامیت کا استعمال صحیح نہیں ہے ورنہ اس طرح بہت سی بیویاں محض اپنے شوہروں کی تابع بنی ہوئی جماعت میں آجائیں گی بغیر اس کے کہ ان کے خیالات اور ان کی زندگی میں کوئی واقعی تبدیلی ہو۔ آپ اپنے گھروں میں اسی طرح تبلیغ کیجیے جس طرح باہر کرتے ہیں اور صبر کے ساتھ مسلسل کوشش کرتے رہیے کہ آپ کی بیویاں، اور آپ کے خاندان کی دوسری خواتین کے خیالات، انداز فکر، نقطۂ نظر اور اخلاق میں وہ حقیقی تبدیلی رونما ہو جو اس جماعت کا کام کرنے کے لیے ضروری ہے۔ جس طرح ہم اس تبدیلی کے بغیر اور پختگی کا ثبوت ملے بغیر مردوں کو جماعت میں شامل نہیں کر سکتے اسی طرح عورتوں کو بھی شامل نہیں کرنا چاہیے۔

تجویز نمبر ۱۴: طاغوتی نظام اور غیر شرعی وسائل معاش سے علیحدہ ہونے والے اشخاص کی اعانت کا انتظام۔

امیر جماعت: اس میں شک نہیں کہ جو لوگ ہمارے عقیدہ و مسلک کو قبول کر کے ان وسائل معاش کو چھوڑتے ہیں جو دین کے خلاف ہیں، انھیں دوسرے مناسب تر وسائل فراہم کرنے میں جس حد تک بھی ہم مدد دے سکتے ہیں ہمیں دینی چاہیے لیکن یہ اعانت صرف شخصی طور پر ہمارے اخلاقی فرائض میں داخل ہے۔ اسے کوئی جماعتی پروگرام بنانا اور جماعت کے اوپر یہ ذمہ داری عائد کرنا کہ اس کا انتظام کرے اصولاً صحیح نہیں ہے۔ جماعت اس کے سوا کچھ نہیں کر سکتی کہ لوگوں کے سامنے حق اور باطل کا فرق واضح کر دے اور ان کے اندر حرام و حلال کی تمیز پیدا کر دے۔ اس کے بعد جو لوگ حق کو حق تسلیم کریں اور باطل سے علیحدہ ہونا چاہیں انہیں حرام کو حرام جان کر اسے چھوڑنا اور حلال کو اختیار کرنا چاہیے۔ ان کا خود یہ اپنا کام ہے کہ وہ اپنے لیے جائز طریق معاش تلاش کریں اور اپنی زندگی کو ناجائز آلائشوں سے پاک کریں۔ اگر کوئی اخلاق صالحہ کی دعوت دینے والی جماعت لوگوں کو بدکاری چھوڑ کر نکاح کا مشورہ دیتی ہے تو اس کے اوپر یہ ذمہ داری عائد نہیں ہوتی کہ وہ ایک شادی ایجنسی کھولے۔ اسی طرح کوئی وجہ نہیں کہ دین حق کی دعوت دینے والی جماعت پر صرف اس لیے معیشت کے انتظام کی ذمہ داری ڈالی جائے کہ وہ لوگوں کو حرام ذرائع چھوڑنے اور حلال ذرائع اختیار کرنے کی ہدایت کرتی ہے۔ البتہ ایسی جماعت کے افراد پر یہ اخلاقی فرض ضرور عائد ہوتا ہے کہ جہاں وہ خود حرام ذرائع سے بچنے اور حلال ذرائع اپنے لیے فراہم کرنے کی سعی کرتے ہیں اس کے ساتھ دوسرے ایسے لوگوں کی مدد بھی کریں جو انہی کی طرح اس غرض کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے ہوں۔ جماعتی حیثیت سے جو کچھ زیادہ سے زیادہ ہم کر سکتے ہیں وہ صرف اتنا ہے کہ چھوٹی چھوٹی صنعتوں اور مختلف تجارتی کاموں کے متعلق اگر کچھ معلومات ہمارے پاس موجود ہوں تو وہ ہم ایسے لوگوں کو فراہم کر دیں جو موجودہ ناپاک نظام معاشی میں کوئی نسبتاً پاک کام کرنا چاہتے ہوں۔ اسی طرح ہم یہ بھی کر سکتے ہیں کہ مختلف ارکان جماعت جو کسی صنعتی یا تجارتی سکیم کو چلانا چاہتے ہوں وہ اگر ہمیں اپنی تجویزوں سے باخبر رکھیں تو ہم دوسرے ارکان کے ساتھ ان کا تعلق قائم کرنے کی کوشش کریں۔

تجویز نمبر ۱۵: سجادہ نشینوں اور پیروں کو اس تحریک کی طرف دعوت دینے کے لیے کوئی خاص قدم اٹھایا جائے کیونکہ ان میں سے کسی ایک شخص کی شرکت بھی کئی ہزار آدمی کی شرکت کی ہم معنی ہے۔

امیر جماعت: اس میں شک نہیں کہ ہمارے ملک میں یہ طبقہ بہت زیادہ با اثر ہے اور لاکھوں کروڑوں آدمی اس سے وابستہ ہیں لیکن اس میں بہت کم آدمی ایسے ہیں جو واقعی صاحب خیر، خدا ترس اور حق پسند ہیں۔ اکثریت اس طبقے میں ایسے لوگوں کی ہے جن سے زیادہ خدا سے پھرے ہوئے لوگ غالباً دنیا میں نہیں ملیں گے۔ انھوں نے حق کے لیے صرف اپنے ہی کان نہیں بند کر رکھے ہیں بلکہ اپنے مریدوں اور معتقدوں کے کانوں اور دلوں پر بھی مہریں لگا رکھی ہیں۔ انھیں دعوت دینے کا فائدہ یہ تو نہ ہوگا کہ وہ حق کی آواز پر لبیک کہیں گے اور اپنی نیم خدائی کو چھوڑنے پر آمادہ ہو جائیں گے البتہ اس کا یہ نتیجہ ضرور ہوگا کہ ہم جن بلوں کے چھتے میں خود پتھر پھینک پھینک کر ان کو کاٹنے پر اکسائیں گے۔ بجائے اس کے کہ آپ ان حضرات کو خطاب کریں آپ کو کوشش کرنی چاہیے کہ ان کے معتقدین کے حلقوں میں صحیح دینی خیالات پھیلائیں اور ان کی کمزوریوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنی تبلیغ میں احتیاط سے کام لیں۔ ان پیروں کا طلسم تو بہر حال ٹوٹنا چاہیے، ہمارے ہاتھ سے نہ ٹوٹے گا تو اشتراکیت کے

ہاتھوں ٹوٹ کر رہے گا، مگر ہماری دعا یہ ہے کہ یہ ہمارے ہاتھ سے نہ ٹوٹے کیونکہ اگر اشتراکیت کے ہاتھ سے یہ ٹوٹا تو ان پیریوں کے ساتھ ساتھ دین بھی ٹوٹ جائے گا۔

تجویز نمبر ۱۶: امیر جماعت ایک وفد لے کر ملک میں تبلیغی دورہ کریں۔

امیر جماعت: یہ تجویز بہت پہلے سے زیر غور تھی لیکن اول تو مرکز کے کاموں کا بار مجھ پر بہت زیادہ ہے پھر کچھ عرصے سے میری صحت بھی مسلسل خراب رہی ہے اس لیے اب تک اس پر عمل نہ ہو سکا۔ میں اس کا منتظر ہوں کہ مرکز کا کام اس حد تک منظم ہو جائے کہ میرے بغیر بھی چلتا رہ سکے اور میری صحت بھی کچھ درست ہو جائے تو انشاء اللہ ملک کے مختلف حصوں میں جانے کی کوشش کروں گا۔

تجویز نمبر ۱۷: عوام میں کام کرنے کے لیے مولانا محمد الیاس صاحب مرحوم کے طریق تبلیغ کو اختیار کیا جائے۔

امیر جماعت: اس کے متعلق میں اپنے خیالات ابتدائی تقریروں میں پیش کر چکا ہوں۔ میں مولانا مرحوم کے طریق کار کی مذمت نہیں کرنا چاہتا۔ جو لوگ ان کے طریق کار پر مطمئن ہوں وہ ان کے کارکنوں میں شامل ہو کر کام کر سکتے ہیں، اور بہرحال یہ بھی ایک کار خیر ہوگا، مگر میں اس کو صحیح نہیں سمجھتا کہ اس جماعت کے لیے کام کا جو طرز میں نے اختیار کیا ہے اس کے ساتھ دوسرے طریقوں کا جوڑ لگانے کی کوشش کی جائے۔ میں نے جس حد تک ان کے طرز تبلیغ سے واقفیت بہم پہنچائی ہے میں اس پر مطمئن نہیں ہوں اور جس قسم کا کلی انقلاب ہمارے پیش نظر ہے اس کے لیے وہ طریقہ کچھ بھی مددگار نہیں ہو سکتا۔

تجویز نمبر ۱۸: تمام علمائے ہند کو جمع کر کے ان کے سامنے یہ دعوت پیش کی جائے۔

امیر جماعت: یہ ایک خیالی تجویز ہے جسے کوئی ایسا شخص قابل عمل نہیں سمجھ سکتا جس کو ان معاملات کے متعلق کوئی عملی تجربہ ہو۔ آپ لوگوں میں سے کوئی شخص بطور خود یہ تجربہ کرنا چاہے تو میں اسے روکتا نہیں، لیکن میں خود اس قسم کا کوئی اقدام نہیں کر سکتا۔ یہ بات کسی نفسانیت پر مبنی نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ میں اس کو لاحاصل سمجھتا ہوں اور اس سے کسی مفید نتیجے کی مجھے توقع نہیں ہے۔ جہاں تک دعوت کے پہنچنے کا تعلق ہے مجھے یہ معلوم ہے کہ اس ملک کے علماء اور تعلیم یافتہ طبقہ کے بیشتر لوگوں تک یہ پہنچ چکی ہے۔ اگر کوئی صحیح و برحق ہونے پر مطمئن ہو جائے تو وہ بغیر اس کے بھی اس پر لبیک کہہ سکتا ہے کہ کوئی اس کے پاس جا کر بالمشافہ دعوت دے۔ اہل حق سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ کہیں سے حق کی پکار سننے اور یہ اطمینان ہو جانے کے بعد کہ یہ واقعی حق کی پکار ہے، صرف اس لیے اپنی جگہ بیٹھے رہیں گے کہ خاص طور سے ان کے در دولت پر حاضر ہو کر صدا نہیں لگائی گئی ہے۔

تجویز نمبر ۱۹: جماعت میں جو علماء ہیں وہ اپنے گرد و پیش کے علاقے کی مقامی جماعتوں میں دورہ کر کے انھیں زندہ رکھنے کی کوشش کریں۔

امیر جماعت: یہ فی الواقع ایک قابل توجہ تجویز ہے۔ جو علماء اس جماعت میں شامل ہوئے ہیں انھیں خود اپنی ذمہ داری کو محسوس کرنا چاہیے اور اپنے وقت کا کچھ حصہ اس کام کے لیے ہمیشہ نکالتے رہنا چاہیے کہ اپنے آس پاس کے علاقوں میں دورہ کر کے مقامی جماعتوں کو حرکت بھی دیتے رہیں، اور ارکان کی اخلاقی اور دینی حالت کو بھی بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کریں۔ لیکن میں اس قسم کے کام حکم سے کرانے کے بجائے رضاکارانہ کرانا چاہتا ہوں۔ بہترین خدمت وہی ہوتی ہے جو انسان اپنے

دلی جذبہ اور احساس ذمہ داری کی تحریک سے کرتا ہے۔ میری تمام تر کوشش یہی ہے کہ لوگوں کو رضاکارانہ خدمت پر اکساؤں اور ان میں اتنا احساس ذمہ داری پیدا کروں کہ وہ اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کا خود جائزہ لیں اور خود ان کو اللہ کے دین کے کام میں زیادہ سے زیادہ بہتر طریقے سے استعمال کرنے کی کوشش کریں۔

تجویز نمبر ۲۰: دعوت و تبلیغ کے کام کو بیرونِ ہند تک وسیع کرنے کی کوشش کی جائے۔

امیر جماعت: یہ چیز بھی ابتداء سے ہمارے پیش نظر تھی اور اگر جنگی موانع پیش نہ آجاتے تو اب تک اس سلسلے میں بھی ہم کچھ نہ کچھ ضرور پیش قدمی کرتے۔ سر دست ہم نے دار العروبہ اسی غرض کے لیے قائم کیا ہے کہ عربی زبان میں لٹریچر تیار کریں اور اسے عربی ممالک میں پہنچانے کی کوشش کریں۔ جنگی رکاوٹیں ختم ہو جانے کے بعد ان شاء اللہ ہم عربی لٹریچر کی اشاعت کا سلسلہ شروع کر دیں گے اور عربی میں ایک ماہوار رسالہ بھی جاری کریں گے۔ پھر میرا ارادہ یہ بھی ہے کہ جب عربی میں کچھ لٹریچر تیار ہو جائے تو جماعت کا ایک وفد لے کر خود حج کو جاؤں اور وہاں مختلف ممالک کے آئے ہوئے زائرین تک اس دعوت کو پہنچانے کی کوشش کروں۔ اس طرح توقع ہے کہ ہمیں بیرونی ممالک کے کچھ اچھے آدمیوں سے شخصی تعلقات قائم کرنے کا موقع بھی مل جائے گا اور زیادہ وسیع پیمانے پر کام کرنے کی راہ کھل سکے گی۔ اس کے علاوہ ہم انگریزی کو بھی ذریعہ اشاعت بنانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں تاکہ ایک بین الاقوامی زبان ہماری دعوت کا آلہ بن سکے۔

تجویز نمبر ۲۱: جماعت کے مکتبے میں خود جماعتی لٹریچر کے علاوہ دوسرا صالح لٹریچر بھی بہم پہنچایا جائے۔

امیر جماعت: یہ تجویز دہلی کے اجتماع میں ہمارے سامنے آئی تھی اور اس وقت مولانا مسعود عالم صاحب کے سپرد یہ کام کیا گیا تھا کہ وہ اردو لٹریچر میں سے ایسی کتابوں کو چھانٹنے کی کوشش کریں جن میں صحیح دینی نقطہ نظر پیش کیا گیا ہو اور جو ہمارے مقصد کے لحاظ سے صالح لٹریچر کی تعریف میں آتی ہوں۔ اس سلسلے میں انھوں نے کافی محنت کی اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اردو زبان اس لحاظ سے بہت غریب ہے۔ ایک مدت سے صحیح دینی تصور ناپید ہے اس لیے جو بہتر سے بہتر لٹریچر بھی موجود ہے اس میں غیر محسوس طور پر ایسی چیزیں آگئی ہیں جو پڑھنے والوں کی غلط رہنمائی کرتی ہیں۔ اسی وجہ سے ہم دوسری کتابوں کی اشاعت اپنے مکتبے کے ذریعے سے کرنے میں بہت زیادہ احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ جب تک ہماری دعوت و تبلیغ کا اثر اتنا وسیع نہیں ہو جاتا کہ ملک کے اہل علم اور اہل قلم عام طور پر اس سے متاثر ہو جائیں، یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ صحیح قسم کا اسلامی لٹریچر بہم پہنچ سکے گا۔ تاہم جو ایک مختصر سی فہرست مولانا مسعود عالم صاحب نے بنائی ہے اس کے مطابق کتابیں فراہم کرنے کی ہم کوشش کریں گے۔

تجویز نمبر ۲۲: ہماری درسگاہوں کے لیے جو نصاب تیار ہو اسے جلدی سے جلدی شائع کرنے کی طرف توجہ کی جائے۔

امیر جماعت: یہ تجویز ہمارے پیش نظر ہے لیکن نصاب تیار ہونے کے بعد یہ فیصلہ کرنا کہ وہ اشاعت کے قابل کب ہو سکے گا ہماری دونوں درسگاہوں کے منتظمین، یعنی مولانا امین احسن صاحب اور غازی محمد عبد الجبار صاحب کا کام ہے۔ سر دست یہ رائے قائم کی گئی ہے کہ نصاب تیار ہوتے ہی فوراً اسے شائع نہ کیا جائے بلکہ عملاً جب ہم اس کا تجربہ کر کے دیکھ لیں کہ جو نتائج ہمیں اس سے مطلوب ہیں وہ حاصل ہو رہے ہیں اس وقت اسے پبلک میں پیش کیا جائے۔

تجویز نمبر ۲۳: زیر تجویز درسگاہوں کے داخلے میں یہ شرط جو عائد کی گئی ہے کہ طلباء کے والدین ہمارے مقصد اور نقطہ نظر

نے نہ صرف متفق ہوں بلکہ اپنے بچوں کو اس نصب العین کے لیے دیدینے کا وعدہ کریں جو ہمارے پیش نظر ہے، اسے اڑا دیا جائے اور داخلے کو عام طلبا کے لیے کھلا رکھا جائے تاکہ ایک کثیر تعداد ہماری درسگاہوں میں آسکے اور ہمیں ان کے ذہن اور اخلاق پر اثر ڈالنے کا موقع مل سکے۔

امیر جماعت: یہ شرط بہت غور و خوض کے بعد عائد کی گئی ہے اور اسے طے کرتے وقت تمام پہلوؤں پر اچھی طرح نظر ڈالی گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بظاہر یہ بات بہت وزنی معلوم ہوتی ہے کہ ہر قسم کے طلباء کو ہم اپنی درسگاہ میں آنے دیں اور اپنی تعلیم و تربیت کے اثر سے ان کو اس حد تک متاثر کرلیں کہ وہ اعتقاداً و عملاً ہمارے ہی ہم مسلک ہوجائیں، لیکن اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس طریقے سے ہم کچھ زیادہ فائدہ نہ اٹھا سکیں گے اور جتنا فائدہ اٹھا سکیں گے اس کی بہ نسبت ہمیں اپنے وقت، ور قوتوں کے ضیاع کا نقصان زیادہ پہنچے گا۔ آجکل عام طور پر لوگ جس غرض کے لیے اپنے بچوں کو پڑھواتے ہیں وہ صرف معاشی غرض ہوتی ہے۔ ان کو دین سے اگر کوئی دلچسپی ہوتی بھی ہے تو وہ صرف اس قدر کہ ان کے بچے نماز روزے کے بھی کچھ پابند ہوجائیں اور دینیات سے کچھ واقفیت بھی بہم پہنچالیں۔ اس سے آگے بڑھ کر وہ ایسی کسی دینداری کے متحمل ہی سے قائل ہوتے ہیں جو ان کے بچوں کی دنیا بنانے میں، خواہ وہ دنیا کیسے ہی ناپاک طریقوں سے بنا کرتی ہو، مانع ہوجائے۔ اس قسم کے لوگ اگر اپنے بچوں کو ہماری درسگاہ میں بھیجیں گے تو ان کے پیش نظر یہ ہوگا کہ یہاں ہماری محنتوں سے فائدہ اٹھا کر وہ انھیں ابتدائی چند جماعتوں تک عام مدارس سے کچھ بہتر تعلیم دلوا لیں۔ اس کے بعد وہ انھیں یہاں سے نکال کر سرکاری درسگاہوں میں داخل کریں گے، امتحان دلوائیں گے اور کم یا زیادہ تنخواہوں کے عوض طاغوت کے ہاتھ بیچ ڈالیں گے۔ طلبہ کا ایک بڑا حصہ ہماری تعلیم و تربیت سے متاثر ہونے کے باوجود والدین کے دباؤ سے مجبور ہو کر اسی راہ پر چلا جائے گا اور بہت کم طالب علم شاید بمشکل پانچ فی صدی ایسے مضبوط نکلیں گے کہ ہمارے نصب العین کو اپنی زندگی کا نصب العین بنالیں اور والدین کے دباؤ کو قبول کرکے کسی غلط راہ پر نہ جائیں۔ سوال یہ ہے کہ ان پانچ فیصدی کو حاصل کرنے کی خاطر ہم ایسے پچانوے فیصدی لڑکوں پر اپنی قوت اور اپنی محنت کیوں صَرف کریں جو دین کے کام نہیں بلکہ طاغوت کے کام آنے کے لیے پرورش کیے جا رہے ہوں۔ پھر عملاً جس جس طریقے سے ان پچانوے فی صدی طلبہ کو راہ راست سے ہٹانے کی کوششیں کی جائیں گی، جس طرح ان پر دباؤ ڈالے جائیں گے، ان کو گھر سے نکالنے اور ان کے خرچ بند کرنے کی دھمکیاں دی جائیں گی، خود ان کے اپنے بھائی بند اور ان کے والدین جس طرح انھیں تنگ کریں گے اور ستائیں گے، اور پھر اچھے اچھے نیک طبع اور بلند ارادے رکھنے والے طلبا بالآخر جس طرح شکست کھا کھا کر پسپا ہوں گے اور اپنے پاکیزہ ارادوں کو طلاق دیں گے، اس کا بہت برا اثر دوسرے طلباء پر پڑے گا اور ان مسلسل پسپائیوں کی بری مثالیں دوسرے طلبا کی اخلاقی قوت کو بھی کمزور کردیں گی۔ پس ہم اپنی درسگاہ کو اور اس کے ماحول کو اس دائمی خطرے میں مبتلا نہیں رکھنا چاہتے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ابتدا ہی سے صرف وہ لوگ اپنے بچوں کو ہمارے ہاں بھیجیں جنھیں معلوم ہو کہ ہم کس غرض کے لیے ان لڑکوں کو تیار کرنا چاہتے ہیں اور وہ خود بھی اسی غرض کے لیے ان کو تیار کرانا چاہتے ہوں۔ ایسے لوگوں کے بچے خواہ وہ کتنی ہی کم تعداد میں کیوں نہ ہوں پوری طرح ہمارے مطلب کے ہوں گے اور ہمارے مقصد کے لیے زیادہ مفید ثابت ہوں گے۔ ممکن ہے کہ اس طرح ہمیں طلبا کی کوئی بہت بڑی تعداد نہ مل سکے، لیکن ہمیں اس کی پروا

نہیں ہے۔ اگر پانچ ایکڑ زمین آپ کو ایسی ملے جو پورے اطمینان کے ساتھ آپ کی ہو تو اس میں کاشت کرنا اس سے زیادہ بہتر ہے کہ ہزاروں ایکڑ زمین آپ کو ملے مگر ہر وقت اندیشہ ہو کہ اس کا بہت بڑا حصہ آپ کی تیار کی ہوئی ہری بھری فصل سمیت آپ سے چھین لیا جائے گا۔ لیکن یہ گمان نہ کرنا چاہیے کہ ہندوستان میں اس غرض کے لیے اپنے بچوں کو دینے والے بہت کم ہوں گے، اتنے کم کہ کوئی درسگاہ ان سے نہ چلائی جا سکے گی۔ میرا اندازہ ہے کہ اس گئی گذری حالت میں بھی اس ملک میں ایسے لوگ کافی تعداد میں موجود ہیں جو اپنے بچوں کو خدا کے لیے وقف کرنے پر تیار ہوں گے اور اس کی پروا نہ کریں گے کہ ان بچوں کی دنیا بنے گی یا نہیں۔

ہماری اس شرط سے ایسے طلبا مستثنیٰ ہوں گے جو دین کے معاملہ میں اپنے والدین سے بغاوت کر کے آئیں اور اپنی عاقبت کو والدین کی مرضی کے مطابق چلا کر خراب کر لینے پر تیار نہ ہوں۔ صرف یہی ایک معاملہ ایسا ہے جس میں والدین سے بغاوت کرنا جائز ہی نہیں، بعض اوقات فرض ہو جاتا ہے، اور ایسے طلبا پر ہم یہ لازم نہ کریں گے کہ وہ اپنے والدین کی رضامندی حاصل کر کے آئیں۔

تجویز نمبر ۲۴: ترجمان القرآن اور کوثر کو ہر رکن لازماً خریدے۔

امیر جماعت: شاید یہ بات آپ کے پیش نظر نہیں ہے کہ آپ ہندوستان میں رہتے ہیں جہاں کی اخلاقی حالت یہ ہے کہ انتہائی بے غرضانہ کام کرنے کے بعد بھی کوئی شخص غرض مندی کے الزامات اور بدگمانیوں سے معاف نہیں رکھا جاتا۔ اس وقت تک جس احتیاط کے ساتھ ہم کام کرتے رہے ہیں اس کے باوجود ہم کو کتب فروش اور تاجر کے الفاظ سے اکثر نوازا جاتا رہتا ہے محض اس لیے کہ کتابیں تو بہرحال ہمارے بک ڈپو میں بکتی ہی ہیں۔ اب کیا آپ ان الزامات کو واقعی ہم پر چسپاں ہی کر دینا چاہتے ہیں؟ براہِ کرم اس قسم کی تجویزیں نہ زبان پر لائیے نہ دل میں سوچیے۔ ترجمان القرآن اور کوثر دونوں کے معاملے میں جماعت کے لوگوں کو بالکل آزادی رہنی چاہیے کہ چاہیں ان کو خریدیں یا نہ خریدیں۔ خریداری کو لازماً کر دینے کی کوئی وجہ نہیں۔ البتہ جماعت کے کاموں سے اور جماعتی افکار سے باخبر رہنے کے لیے ان کا مطالعہ ضروری ہے۔ مگر اس کے لیے کسی خریدار سے لے کر پڑھ لینا بھی کافی ہو سکتا ہے۔

تجویز نمبر ۲۵: ہر رکن اپنی زکوٰۃ بیت المال ہی میں داخل کیا کرے۔

امیر جماعت: اس کے متعلق میں رپورٹوں پر تبصرے کے سلسلے میں ہدایات دے چکا ہوں اور مجھے امید ہے کہ اب اس سلسلے میں احکام کی پوری پابندی کی جائے گی۔

تجویز نمبر ۲۶: ہر رکن اپنی آمد و خرچ کا حساب اپنی مقامی جماعت کے امیر کے سامنے پیش کیا کرے۔

امیر جماعت: یہ مطالبہ ہم از روئے شرع اپنے ارکان سے نہیں کر سکتے، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا نہیں کیا ہے۔

تجویز نمبر ۲۷: ہر رکن یومیہ چار آنے بیت المال کے لیے بچائے۔

امیر جماعت: چونکہ از روئے شریعت ہمیں ایسی پابندیاں عائد کرنے کا حق نہیں ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں زکوٰۃ اور صدقات واجبہ کے سوا کسی قسم کے انفاق کو لازماً نہیں کیا گیا ہے، اس لیے ہم بھی ایسی کوئی پابندی اپنی جماعت میں عائد نہیں کر سکتے۔ درحقیقت انفاق فی سبیل اللہ کا اصل فائدہ ہی ضائع ہو جاتا ہے اگر اسے لازم کر دیا جائے۔ جس حد تک اجتماعی ضروریات کے لیے ناگزیر تھا، اللہ تعالیٰ نے ہر صاحب استطاعت آدمی پر خود ہی انفاق لازم کر دیا۔ اس کے بعد یہ بات ہر شخص کے

تعلق باللہ اور اس کی طلب خیرات و حسنات اور دین حق کے ساتھ اس کے قلبی لگاؤ پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ جتنا وہ قوی ہو اتنا ہی زیادہ آدمی اپنے دلی جذبے سے انفاق کرے۔ جب جتنا وہ کمزور ہو اسی قدر اس سے انفاق کا بھی کم ظہور ہو۔ یہ بات اس شریعت کے اصول میں سے ہے کہ بہت کم نیکیوں کا مطالبہ از روئے قانون آدمی سے کیا گیا ہے اور بہت زیادہ نیکیاں قانونی مطالبے کی حدود سے باہر رکھی گئی ہیں تاکہ انسان رضاکارانہ طریق پر انھیں اختیار کرے۔ دنیا میں انسان کی اخلاقی اور روحانی ترقی اور آخرت میں اللہ کے ہاں اس کی مقبولیت کا تو سارا انحصار ہی رضاکارانہ نیکی پر ہے۔ اس نکتے کو اگر آپ لوگ ذہن نشین رکھیں تو ایسی تجویزیں سوچنے کے بجائے اپنی توجہ خود اپنے اندر بھی اور اپنے رفقا کے اندر بھی اس جذبے کو ابھارنے اور نشوونما دینے پر صرف کریں گے جس کی تحریک سے انسان خدا کے لیے اور اس کے دین کے لیے اپنے وقت، مال اور قوتوں کی قربانی کیا کرتا ہے۔

تجویز نمبر ۲۸: جماعت میں جو لوگ اہل ہنر ہیں وہ اپنے دوسرے رفقا کو ہنر سکھائیں اور جو ذی استطاعت ارکان ہیں وہ غریب ارکان کو اپنے ہاں ملازم رکھیں۔

امیر جماعت: اس قسم کی چیزوں کو مستقل تجاویز بنانے سے ہمیں خطرہ یہ ہے کہ ہم اپنے اصل نصب العین اور اس کی جدوجہد سے ہٹ کر چھوٹی چھوٹی چیزوں میں لگ جائیں گے اور یہ چیزیں ہمارا اصل پروگرام بنتی چلی جائیں گی۔ اس لیے بجائے اس کے کہ ایسی تجویزوں کو اجتماعات میں لایا جائے اس امر کی کوشش ہونی چاہیے کہ ارکان جماعت میں خود یہ اسپرٹ پیدا ہو جائے کہ جو شخص جس جس طرح اپنے بھائیوں کے کام آسکتا ہو اس میں ذرہ برابر دریغ نہ کرے۔

تجویز نمبر ۲۹: لٹریچر کی اشاعت کے لیے اخبارات و رسائل میں اشتہارات دیا جائے اور ملک میں جو مختلف سیاسی و مذہبی جماعتوں کے اجتماعات ہوتے ہیں ان میں اپنی کتابوں کے سٹال لگائے جائیں۔

امیر جماعت: اشتہارات کے متعلق ہمارا تجربہ یہ ہے کہ جس اخبار یا رسالے نے اپنے مخصوص طرز خیال کا ایک حلقہ پیدا کر لیا ہے اس کے حلقہ اشاعت میں انہی چیزوں کی مانگ پیدا ہو سکتی ہے جو اس کے طرز خیال سے کچھ نہ کچھ مناسبت رکھتی ہوں۔ اگر ہم اپنی مطبوعات کا اشتہار ایسے اخبارات اور رسائل میں دیں جو پبلک کے ذہن سے کسی اور ہی طرح کا اپیل کر رہے ہوں تو ان کے حلقوں میں سے اتنی مانگ آنے کی امید نہیں ہے جس سے اشتہار کا خرچ بھی نکل سکے۔ اس لیے ہم کو صبر کے ساتھ اپنی ہی کوشش سے اپنے حلقۂ اشاعت کو وسیع کرنے پر اکتفا کرنا چاہیے۔ ہمارا لٹریچر اللہ کے فضل سے خود اپنی جگہ پیدا کر رہا ہے اور اپنی ذاتی کشش سے روز بروز زیادہ آدمیوں کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ اس کے ساتھ اگر ہمارے ارکان اور ہمارے خیالات سے دلچسپی اور ہمدردی رکھنے والے لوگ بھی مسلسل سعی کرتے رہیں تو ان شاء اللہ ہمیں اشتہار کی ضرورت کبھی محسوس نہ ہوگی۔

کانفرنسوں میں اسٹال لگانے کے لیے زیادہ مناسب یہ ہے کہ جس علاقے میں کوئی کانفرنس منعقد ہو رہی ہو اسی علاقے یا اس کے قریب کے حلقے کی کوئی مقامی جماعت وہاں اسٹال لگایا کرے۔ مرکزی مکتبے کے وقار سے یہ بات فروتر ہے کہ یہاں سے ہمارے آدمی ہر جلسے میں کتابیں لے کر پہنچ جایا کریں۔

تجویز نمبر ۳۰: ترجمان القرآن کے وہ بہت سے سابق مضامین جو ابھی تک کتابی شکل میں شائع نہیں ہوئے ہیں ان کی اشاعت کی طرف توجہ کی جائے۔ نیز اب تک جو اعتراضات اور سوالات اس تحریک پر کیے گئے ہیں اور ان کے جوابات

ترجمان القرآن میں دیے جاتے رہے ہیں ان کو بھی یکجا کرکے شائع کردیا جائے۔

امیر جماعت: تجویز کے حصہ اول کے متعلق یہ گذارش ہے کہ اگر جنگی حالات کی وجہ سے اشاعت کی راہ میں مشکلات نہ پیدا ہوجاتیں تو یہ کام بہت پہلے ہوچکا ہوتا۔ ہم منتظر ہیں کہ کاغذ پر سے پابندیاں کچھ کم ہوجائیں تو جلدی سے جلدی وہ تمام چیزیں شائع کردی جائیں جو اس وقت تک رُکی ہوئی ہیں۔

دوسرے حصے کے متعلق میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ بہت دنوں سے مجھے خود اس کی ضرورت کا احساس ہے، مگر کارکنوں کی کمی کی وجہ سے مطلوبہ مجموعہ مرتب نہیں کیا جاسکا۔ اگر کوئی صاحب ہمت کرکے پچھلے چار پانچ سال کے رسالوں میں سے اعتراضات و جوابات کو چھانٹ لیں اور انھیں یکجا نقل کرکے میرے پاس بھیج دیں تو اس کو ترتیب دینا میرے لیے آسان ہوجائے گا اور میں کوشش کروں گا کہ اب تک جو اعتراضات مجھ تک زبانی پہنچے ہیں اور ان کے جو جوابات میں نے دیے ہیں انھیں بھی قلمبند کردوں توقع ہے کہ یہ چیز ہماری تحریک کے لیے بہت مفید ثابت ہوگی۔

تجویز نمبر ۳۱: تفہیم القرآن کی الگ الگ سورتوں کو رسالوں کی شکل میں شائع کردیا جائے۔

امیر جماعت: اس وقت تک رسالے میں تفہیم القرآن کے جو حصے شائع کیے جاتے رہے ہیں وہ صرف اہل علم سے مشورے کے لیے ہیں۔ جب تک میں نظر ثانی کرکے یہ اطمینان نہ کرلوں کہ وہ کتابی شکل میں شائع کرنے کے قابل ہے اس وقت تک اس کا کوئی حصہ اشاعت عام کے لیے نہ پیش کیا جائے گا۔ سردست اگر اس سے کوئی فائدہ اٹھانا چاہے تو ترجمان القرآن میں شائع شدہ صفحات پر قناعت کرے۔

تجویز نمبر ۳۲: علوم اسلامیہ کی تدوین جدید اور ممالک اسلامیہ کے حالات کے مطابق اسلامی لٹریچر کی تیاری۔

امیر جماعت: تجویز کا حصہ اول ہماری اس اسکیم میں شامل ہے جو ایک اکیڈمی کے قیام کے متعلق ہمارے پیش نظر ہے۔ حصہ دوم کو کسی حد تک ہمارا دارالعروبہ ان شاء اللہ عمل میں لائے گا، لیکن یہ بہت مشکل ہے کہ ہم باہر کے مختلف ملکوں کی سیاسی، تمدنی، اخلاقی اور ذہنی حالت کو پیش نظر رکھ کر ہر ایک کے لیے الگ الگ لٹریچر تیار کریں۔ دنیا میں جتنی بھی عالمگیر تحریکیں اٹھتی ہیں، ہر ایک کی ابتدا کسی ایک علاقے سے ہوتی ہے اور آغاز میں اسی علاقے کے حالات کو سامنے رکھ کر ان اصولوں کو تنقید و تشریح اور عملی انطباق کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے جن پر وہ تحریک مبنی ہوتی ہے۔ پھر جب دوسرے ملکوں تک اس تحریک کے اثرات پہنچتے ہیں اور مقامی لوگ ان سے متاثر ہوتے ہیں تو وہ خود ہی اپنے اپنے علاقوں کے حالات کی مناسبت سے لٹریچر تیار کرنے لگتے ہیں۔ خود قرآن مجید میں بھی یہی طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ اس لیے بجائے اس کے کہ ہم بیرونی ممالک کے لیے ان کے حالات کے لحاظ سے الگ الگ لٹریچر تیار کریں یہ زیادہ مناسب اور زیادہ قابل عمل ہے کہ ہمارے مرکز سے اسی ملک کے حالات کو جنھیں ہم زیادہ بہتر جانتے ہیں ملحوظ رکھتے ہوئے لٹریچر تیار ہو اور اسی کو دوسری زبانوں میں منتقل کردیا جائے۔

تجویز نمبر ۳۳: ارکان کو فروعی بحثوں سے بچنے اور جزئیات کے غیر معتدل اہتمام سے اجتناب کرنے کی ہدایات دی جائیں۔

امیر جماعت: یہ کام قیام جماعت کی ابتدا سے کیا جارہا ہے۔ خود دستور میں اس کے متعلق ہدایات موجود ہیں اور میں ہمیشہ اپنی تقریروں اور تحریروں میں اس پر زور دیتا رہتا ہوں لیکن باقاعدہ احکام دے کر اس چیز کو روکنے سے فائدے کی نسبت

نقصان کا زیادہ اندیشہ ہے۔ جوں جوں لوگوں کی ذہنیت بدلتی جائے گی اور ان کا پرانا انداز فکر نئے انداز فکر کے لیے جگہ چھوڑتا جائے گا یہ مرض آپ سے آپ بتدریج کم ہوتا چلا جائے گا۔

تجویز نمبر ۳۴: دستور کی دفعہ ۹ پر سختی سے عمل ہونا چاہیے اور اس کی خلاف ورزی کرنے والے رکن کو جماعت سے خارج کر دینا چاہیے۔

امیر جماعت: اس پر ابتدا قیام جماعت سے عمل ہو رہا ہے۔ بیچ کے دور میں اگر اس معاملے میں کچھ ڈھیل رہی بھی ہے تو وہ صرف شعبۂ تنظیم کے نہ ہونے کی وجہ سے رہی ہے کیونکہ ہمارے پاس ارکان کی اخلاقی اور عملی حالت جانچنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ لیکن اب تنظیمی کام باقاعدہ شروع ہو جانے کے بعد سے ہم دستور کو پوری قوت سے نافذ کر رہے ہیں اور جو چیزیں دستور میں لازم نہیں ان کے معاملے میں کسی کے ساتھ رعایت نہیں کرتے۔ مقامی جماعتوں کے امراء کو بھی اس معاملے میں ہمارے ساتھ پورا تعاون کرنا چاہیے تاکہ جماعت کے نظام میں کوئی کمزوری نہ رہنے پائے۔

تجویز نمبر ۳۵: ہر مقامی جماعت اپنے شہر کے طلبہ اور عوام کو ہر ماہ ایک بار ضرور مخاطب کرے۔

امیر جماعت: یہ تجویز اگرچہ مفید ضرور ہے لیکن سردست ہم اس کو اس لیے منظور نہیں کر سکتے کہ متعدد مقامات پر ہماری جماعتوں میں ایسے کارکن موجود نہیں ہیں جن پر عام خطاب کی ذمہ داری ڈالی جاسکے۔ جہاں ایسے ارکان موجود ہوں وہاں کے مقامی امیروں کو اس طرف توجہ کرنی چاہیے۔ لیکن عمل شروع کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ جن لوگوں کو وہ عام خطاب کے لیے موزوں پاتے ہوں ان کی اہلیت کا خود بھی پوری طرح امتحان کر لیں اور ہمیں بھی ان کے متعلق ضروری معلومات بہم پہنچا کر یہ اطمینان دلا دیں کہ خطاب عام کی ذمہ داری ان پر ڈالنے سے جماعت کی غلط نمائندگی تو نہ ہوگی۔

ان تجاویز کا سلسلہ ساتویں اجلاس تک چلتا رہا۔ اس کے بعد امیر جماعت نے مولانا امین احسن صاحب کو جماعت سے خطاب کرنے کے لیے کہا۔

اجلاس ہفتم

(بتاریخ ایضاً بعد نماز ظہر)

مولانا امین احسن صاحب اصلاحی کی تقریر

حاضرین!

آپ کے اس اجتماع میں میرا فرض ایک ناخوش گوار فرض ہے۔ مجھے آپ کی پیش کی ہوئی رپورٹوں پر تبصرہ کرنا، ان کی خامیوں پر متنبہ کرنا اور آئندہ کے لیے آپ کو آپ کی غلطیوں سے ہوشیار کرنا ہے۔ مجھے ان رپورٹوں کے اچھے اور مفید پہلوؤں کو نظر انداز کرنا ہے اور صرف عیوب پر نظر ڈالنی ہے۔ یہ عیب چینی ممکن ہے آپ میں سے بہتوں کو ناگوار گذرے لیکن مجھے بہرحال یہی فرض ادا کرنا ہے۔ اگرچہ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ امیر جماعت نے مناسب مواقع پر آپ کے کاموں پر تبصرہ بھی کر دیا ہے اور آپ کو ضروری ہدایات بھی دے دی ہیں جس سے میرا کام ایک حد تک ہلکا ہو گیا ہے تاہم بعض باتوں کی طرف مجھے بھی آپ کو متوجہ کرنا ہے۔

رپورٹوں کی ترتیب | میں سب سے پہلے آپ کو رپورٹوں کی ترتیب کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔ رپورٹوں میں غیر متعلق باتیں بالکل نہیں ہونی چاہئیں۔ ان کو مرتب کرتے وقت اس امر کو پیش نظر رکھنا چاہیے کہ ان سے مقصود صرف یہ معلوم کرنا ہوتا ہے کہ آپ کس مقام پر ہیں، وہاں کے حالات کیا ہیں، جماعت کے مقاصد کے پھیلنے کے امکانات وہاں کس حد تک ہیں، اب تک آپ نے کیا کیا ہے، آئندہ کیا کر سکنے کی توقع ہے، آپ کے رفقاء کا کیا حال ہے، ہمدردوں کی ہمدردی کی نوعیت کیا ہے، اور مزاحمتیں اور رکاوٹیں وغیرہ کس درجہ اور کس قسم کی ہیں۔ یہ اور اس طرح کے ضروری سوالات ہیں جن پر آپ کی ساری توجہ مرکوز ہونی چاہیے۔ اسی طرح کی باتیں مرکز بھی آپ سے معلوم کرنا چاہتا ہے اور یہی باتیں ہیں جن کے جماعت کے ارکین بھی جاننے کے خواہشمند ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ غیر متعلق باتیں جو آپ اپنی رپورٹوں میں لکھتے ہیں ان سے وقت بھی ضائع ہوتا ہے، اور بہت سے مفید مصالح کا نقصان بھی ہوتا ہے۔ بالخصوص ذاتی حالات اور افراد و اشخاص کی مدحت و منقصت کا تو کوئی شائبہ بھی ان رپورٹوں میں نہیں ہونا چاہیے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس طرح کی رپورٹ مرتب کرنا جو تمام ضروری باتوں پر حاوی اور ساری غیر ضروری باتوں سے خالی ہو کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہ بڑی مہارت کا کام ہے لیکن اگر آپ میں صرف کار آمد باتوں کا اہتمام پیدا ہو جائے اور دل خود ستائی کی خواہش، اور دوسروں کی تحقیر کے جذبہ اور مبالغہ اور آرائش بیان سے خالی ہو جائے تو آپ کا کام بھی نہایت سہل ہو جائے گا اور ان رپورٹوں سے ہمارا اصل مقصود ہے وہ بھی بہتر طریق پر حاصل ہو سکے گا۔

اعتراف تقصیر کا فتنہ | ایک خاص چیز جو میں نے آپ کی رپورٹوں میں اس مرتبہ محسوس کی ہے وہ یہ ہے کہ آپ پر اعتراف تقصیر بہت غالب ہوتا جاتا ہے۔ ایک آدمی اگر سچائی کے ساتھ اپنی کوتاہیوں کا اعتراف کرتا ہے تو یہ ایک مستحسن عادت ہے لیکن اس کا ایک پہلو خطرناک بھی ہے جس سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ اس سے ایک اندیشہ تو یہ ہے کہ مبادا یہ چیز آپ کی عادت بن جائے اور اس کے نیچے ادائے فرض کا شعور دب کے رہ جائے اور دوسرا اندیشہ یہ ہے کہ اس سے بسا اوقات آدمی میں منکسرانہ کبر پیدا ہو جاتا ہے جس کا پیدا ہونا ایک سخت و شدید فتنہ ہے اور ہماری دلی آرزو ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے ہر مسلمان کو محفوظ رکھے۔ ایک آدمی اگر ایک امر کو حق سمجھ گیا ہے تو اس کا فرض ہے کہ اس حق کے لیے ہر طرح کی زحمتیں اٹھائے اور ساری صعوبتیں جھیلے۔ جو شخص حق کو پامال ہوتے دیکھتا ہے اور اس کے لیے اس کے دل میں حمیت نہیں پیدا ہوتی وہ دو حالتوں سے خالی نہیں یا تو اس پر حق کی اصلی قدر و قیمت واضح نہیں ہوئی ہے، اور یہ علم و معرفت کی خامی ہے یا اس کے اندر باطل کا رعب بیٹھا ہوا ہے اور یہ دل کا فساد ہے۔ ایک عاقل اور سلیم الطبع انسان سے سب سے پہلے جس بات کی توقع ہونی چاہیے وہ یہی ہے کہ وہ کبھی کسی حق کو مظلوم اور پامال دیکھنے پر راضی نہ ہو۔ جو شخص حق کی مظلومیت پر راضی ہے وہ انسانیت کے جوہر سے خالی ہے اور جو شخص انسانیت کے جوہر سے خالی ہے افسوس ہے اگر وہ پیدا ہوا اور اس سے بڑھ کر افسوس اس بات کا ہے کہ وہ زندہ ہے۔ اگر آدمی میں علم کی کمی ہے تو اس کا فرض ہے کہ اللہ کی کتاب کے ذریعہ سے اپنے علم کو بڑھائے اور اگر ہمت کی کمی ہے تو چاہیے کہ اللہ سے دعا کرے کہ خدا اس کو توفیق عمل دے اور پست ہمتی اور بزدلی کی بیماریوں سے نجات بخشے۔

جماعت اسلامی کا قیام بالکل بے سود ہوگا اگر اس کے بعد بھی ہمارا علم صحیح نہ ہو، اور ہمارے دلوں میں بزدلی کا شیطان بیٹھا ہی رہے اور ہم محض اعتراف تقصیر کے پردہ میں اپنی کمزوریوں کو چھپاتے رہیں۔ ہم جو لٹریچر شائع کر رہے ہیں اس کا مقصود یہی ہے کہ

لوگوں پر حق واضح ہو اور جماعتی زندگی کا نظام اسی لیے اختیار کیا ہے کہ ایک کی مضبوطی دوسرے کی کمزوری کا ازالہ کرنے میں معین ہو اور باہمی تعاون سے وہ سرگرمی اور جدو جہد وجود میں آسکے جو اس وقت حق کی خدمت کے لیے مطلوب ہے۔ اب یہ آپ کا کام ہے کہ آپ میں طلب علم کی رغبت پیدا ہو اور جماعتی زندگی کی برکتیں حاصل کرنے کی کوشش کریں لیکن ہم کو سخت حیرت ہوتی ہے کہ لوگ خود اپنی ذمہ داریوں کی نسبت بھی یہی خواہش رکھتے ہیں کہ مرکز ہی ان کو بھی پورا کرے۔ لٹریچر شائع کرکے لوگوں میں علم پیدا کرے اور پھر ہاتھ پاؤں بن کر ان کے ذمہ کے عمل کو بھی پورا کرے۔ جو لوگ اس طرح کی خواہشیں اپنے دل کے اندر رکھتے ہیں ان کو اس امر سے آگاہ ہونا چاہیے کہ جو کام ان کے کرنے کے ہیں انہی کو کرنے ہوں گے۔ اور وہ کام صرف تمنائیں کرنے سے نہیں بلکہ کرنے سے پورے ہوں گے۔ ہم کو کوئی ایسا افسوں نہیں معلوم ہے جو ہم یہاں سے بیٹھے بیٹھے پھونک دیں اور سارے کام بن جائیں۔ ہم حق کو واضح کرسکتے ہیں اور اس کی خدمت کے لیے اپنا حصہ پورا کرسکتے ہیں، لیکن دوسروں کے اندر اس کے لیے ہمت پیدا کرنا ہمارے اختیار سے باہر ہے۔

بعض لوگوں کے اندر یہ خواہش بھی پائی جاتی ہے کہ جماعت کے کاموں کی رفتار تیز کرنے کے لیے کسی تیز رو جماعت کے ساتھ تعاون کرلیا جائے اگرچہ اس کی تیز روی کسی سمت میں ہو۔ جن لوگوں کے دماغوں میں اس طرح کی باتیں آتی ہیں وہ لوگ ابھی جماعت اسلامی کے مزاج سے بہت دور ہیں، ان کو چاہیے کہ وہ جماعت کے لٹریچر کا اچھی طرح مطالعہ کریں تاکہ ان کے دماغ کی الجھنیں دور ہوں۔ ہم کو صرف تیز روی مطلوب نہیں ہے بلکہ صحیح سمت میں تیز روی مطلوب ہے۔ کسی غلط سمت میں تیز روی سے ہمارے نزدیک یہ بہتر ہے کہ آدمی صحیح سمت کی طرف رخ کرکے کھڑا رہے۔ جو شخص کسی غلط راہ پر تیزی کے ساتھ بھاگا جارہا ہے اس کی حالت پر رشک کرنا حماقت اور اس کو لائق تقلید جاننا ہلاکت ہے۔ جن لوگوں کے دماغوں میں اس طرح کے خیالات گزرتے ہیں ان کے لئے جماعت اسلامی میں داخل ہونے سے زیادہ بہتر یہ تھا کہ ابھی وہ تیز رو جماعتوں کی تیز روی کا کچھ دنوں اور تجربہ کرتے۔ اس کے بعد اگر وہ ہمارے ساتھ آتے تو شاید ہمارے لیے زیادہ زحمت کا سبب نہ بنتے۔

مخالفتوں کا خیر مقدم یہ نہایت خوشی کی بات ہے کہ ہمارے ارکان میں مخالفتوں سے جو مرعوبیت تھی وہ بہت کم ہو رہی ہے۔ اب لوگوں میں مزاحمتوں کا مقابلہ کرکے آگے بڑھنے کی ہمت پیدا ہو رہی ہے۔ یہ جماعتی زندگی کی برکت ہے اور اس برکت کا ظاہر ہونا اس بات کی شہادت ہے کہ ہماری جماعتی زندگی کا ارتقاء صحیح رخ پر ہو رہا ہے۔ لیکن یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ہم جس راہ پر چلنے کے لیے اٹھے ہیں اس راہ میں صرف یہ کافی نہیں ہے کہ مخالفتوں سے مرعوبیت کم ہو جائے۔ یہ تو اس راہ کا پہلا مطالبہ ہے۔ اس کے بغیر تو آپ اس راستہ میں ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتے۔ اس راہ کا اصل مطالبہ اس سے بہت زیادہ ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم میں مخالفتوں کے خیر مقدم کا جذبہ پیدا ہو جائے۔ حق کا راستہ ہو یا باطل کا، اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ جو شخص جس راہ کو اختیار کرتا ہے اس راہ میں اس کی آزمائش ہوتی ہے اور راہ حق کا تو امتیازی نشان ہی یہی ہے کہ وہ شروع سے آخر تک آزمائشوں سے بھری ہوتی ہے۔ جس طرح ریاضی کا ایک ذہین طالب علم کسی مشکل سوال سے خوش ہوتا ہے کہ اس کو اپنی جودت طبع کے آزمانے کا ایک اور موقع ہاتھ آیا اسی طرح ایک صادق العزم مومن کو کسی نئی آزمائش سے مقابلہ کرکے خوشی ہوتی ہے کہ اس کو حق کے ساتھ اپنی وفاداری کے ثبوت دینے کا ایک اور موقع بہم پہنچا۔ ٹمٹماتے ہوئے دیئے بے شک ہوا کے جھونکوں سے گل ہو جاتے ہیں لیکن بھڑکتے ہوئے تنور کو ہواؤں کے جھونکے اور زیادہ بھڑکا دیتے ہیں۔ اب اپنے اندر یہ صلاحیت پیدا کیجیے کہ جس طرح ایک بھڑکتا ہوا تنور گیلی لکڑیوں سے بجھنے کے بجائے ان کو اپنی غذا

بنا لیتا ہے اسی طرح آپ مخالفتوں سے دبنے کے بجائے ان سے غذا اور قوت حاصل کریں۔ جب تک ہم میں یہ قابلیت نہ پیدا ہو جائے امید نہیں کہ ہم خدا کے دین کی کوئی اچھی خدمت کر سکیں۔

آپ نے جن مخالفتوں کا ذکر کیا ہے وہ مختلف قسم کی ہیں لیکن ان میں سے ڈرنے کی چیز ایک بھی نہیں۔ دنیا میں حق کی خدمت کے لیے جو جد و جہد بھی کبھی ظہور میں آئی ہے اس کے ساتھ یہ مخالفتیں بھی آپ سے آپ پیدا ہوئی ہیں اور قرآن نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ ان کا پیدا ہونا عین حکمت الٰہی کے مطابق ہے۔ یہی مومن صادق اور بوالہوس کے درمیان امتیاز کی کسوٹی ہیں اور انہی سے پیروؤں کے اندر انسان کے اختیار کی آزمائش ہوتی ہے۔ پس ان مخالفتوں سے ہراساں ہونے کی ضرورت نہیں ہے البتہ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرنی چاہیے کہ وہ ہر مرحلہ میں ہمیں ثابت قدم رکھے اور ہمارے عزم و ایمان کی حفاظت فرمائے۔

ایک سوال کا جواب جماعت کے ارکان میں ایک عام سوال یہ بھی پایا جاتا ہے کہ جب جماعت اسلامی کی دعوت تمام تر اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت سے ماخوذ ہے بلکہ سر تا سر کتاب و سنت کی پیروی ہی کی دعوت ہے اور مخالفین بھی باوجود انتہائی سعی کے اب تک اس کی کوئی بات کتاب و سنت کے خلاف نہیں ثابت کر سکے ہیں تو آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ مسلمان اس کو قبول کرنے میں اتنی دیر لگا رہے ہیں۔ یہ سوال ہم میں سے بہتوں کو حیرانی میں ڈالے ہوئے ہے اور بسا اوقات دوسروں کی اس بے پروائی کی وجہ سے ہم میں سے بعضوں کی نظر میں وہ حق بے وقعت ہو جاتا ہے جو خود ان پر منکشف ہو چکا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس سوال پر غور کیا جائے۔ ہم نے جہاں تک غور کیا ہے اس خالص دینی دعوت سے مسلمانوں کی بے پروائی کے اسباب نہایت گہرے ہیں۔ مسلمان اپنی موجودہ حالت تک ایک دو دن میں نہیں پہنچے ہیں۔ ان کو درجہ بدرجہ اس حالت تک لایا گیا ہے اور ہر منزل میں ان کو از روئے کتاب و سنت یہ اطمینان دلانے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہی حالت آج اسلام و ایمان کا تقاضا ہے۔ ان کے حق سے انحراف پر ایک طویل زمانہ گذر چکا ہے اور اس غلط راہ کے ہر موڑ پر انھوں نے دوتوں یہ سمجھ کر قیام کیا ہے کہ یہ عین دین و شریعت کی صراط مستقیم ہے اور ان کی اس غلط فہمی کے راسخ کرنے میں ارباب دین نے حصہ لیا ہے اور اس بے راہ روی کے نہ صرف جواز بلکہ استحسان پر ضخیم فقہی اور کلامی تصنیفات مرتب کر دی گئی ہیں یہاں تک کہ ان کو یقین ہے کہ ان کا جو قدم بھی اٹھا ہے وہ شریعت کے دائرہ کے اندر اٹھا ہے اور آج بھی جہاں وہ ہیں شریعت ہی کا ایک مقام ہے اس سے الگ نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ جس جماعت کو اس طرح درجہ بدرجہ گرایا گیا ہو جس کا گرنا اس طرح مخفی ہو جس کے زوال کی تاریخ اتنی لمبی ہو جس کو یہ یقین دلایا گیا ہو کہ اس کا یہ گرنا گرنا نہیں بلکہ اچھلنا ہے، جو اس غلط فہمی میں ہو کہ وہ اپنی موجودہ حالت میں بھی شریعت سے الگ نہیں بلکہ عین شریعت کے مطابق ہے وہ آپ کی دعوت کو کس طرح آسانی کے ساتھ قبول کر سکتی ہے جو ان سے کسی جزئی ترمیم و اصلاح کا مطالبہ نہیں کرتی بلکہ ان سے سچی توبہ اور کامل اصلاح کا مطالبہ کرتی ہے۔ جب آپ ان سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ یاایھاالذین آمنوا آمنوا اے وہ لوگو جو ایمان کے مدعی ہو حقیقی ایمان لاؤ، اور ان کے اعمال سے لے کر ان کے عقائد تک میں رخنہ بتاتے ہیں تو قدرتی طور پر ان کو اس بات سے چوٹ لگتی ہے اور ان کی دینداری کا دیرینہ پندار اس سے مجروح ہوتا ہے۔ وہ یہ بات آسانی کے ساتھ ماننے کے لیے تیار نہیں ہو سکتے کہ وہ آج تک ایک بالکل غلط راہ پر بھاگ رہے تھے۔ انسان کی یہ فطرت ہے کہ وہ اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ الاؤنس کا مستحق سمجھتا ہے اور مسلمانوں کو تو یہ غلط فہمی بھی ہے کہ اسلام ایک آسان دین ہے جس کو ہر حالت کے مطابق کیا جا سکتا ہے اس وجہ سے وہ تنگ راہ جو آپ

ان کے سامنے پیش کرتے ہیں اس پر آنے سے جھجکتے ہیں اور کھینچتے ہیں بلکہ جو وہ حالت بھی دینداری ہے اگرچہ نہیں ہے جو
انھوں نے اختیار کر رکھی ہے تو بلاوجہ زندگی کو قیدوں میں گھیرنے سے کیا فائدہ؟ پس جب تک کہ آپ ان پر یہ بات پوری طرح
واضح نہ کر دیں کہ ان کی موجودہ زندگی اسلام سے بالکل بے ربط ہو گئی ہے اور اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لیے ان کے دلوں کو
اپنے دلائل سے کھول بھی نہ دیں اس وقت تک توقع نہیں کہ وہ ہماری دعوت قبول کرنے پر آمادہ ہوں۔ لیکن یہ کام آسان نہیں
ہے۔ اس کو ہر شخص انجام نہیں دے سکتا۔ ہماری دعوت کے اسی پہلو سے [illegible] ناگوار ہوتے ہیں اور اس کے تحت غلط فہمیاں پیدا
ہوتی ہیں اور خواہ مخواہ کو نہیں سے لوگوں کو ہمارے خلاف بھڑکنے کا مواد ہاتھ آتا ہے۔ اس وجہ سے نہایت ضروری ہے کہ ہم
ہماری جماعت کے افراد دعوت کے اس پہلو کو اچھی طرح سمجھ لیں اور جو لوگ اس کو اچھی طرح نہ سمجھے ہوں وہ کم از کم اس پہلو پر لوگوں
سے زبانی گفتگو کرنے میں احتیاط برتیں تاکہ بلاوجہ ہمارے کام میں رکاوٹیں نہ پیدا ہوں۔

علماء کی بے پروائی ہماری دعوت سے عام مسلمانوں کی بے پروائی کی وجہ یہ ہے۔ رہے علماء تو ان کی نسبت ہر شخص جانتا ہے کہ یہی حضرات ہیں
جنھوں نے مسلمانوں کی ان کی موجودہ [illegible] دینداری اور تقویٰ، اسلام اور ایمان
توحید اور رسالت کا موجودہ مفہوم جو عوام کے ذہنوں میں ہے تمام تر انہی کا پیدا کیا ہوا ہے۔ یہ لوگ نیک نیتی کے ساتھ یہ سمجھتے ہیں
کہ یہ انھی کا کام تھا کہ تمام آفات و مصائب کے اندر سے وہ اسلام کو بچا لائے اور آج بھی اس کو بچائے ہوئے ہیں۔ ایسے لوگوں سے
جو اتنی پیچ در پیچ خوش گمانیوں میں مبتلا ہوں آپ یہ کیسے توقع کر سکتے ہیں کہ آج وہ کھلے دل سے اس بات کا اقرار کریں گے
کہ آج تک انھوں نے جو رہنمائی کی ہے وہ غلط ہے اور صحیح راہ وہ ہے جس کی دعوت فلاں جماعت دے رہی ہے۔ بلاشبہ حق
پرستی کا تقاضا یہی ہے کہ اس معاملہ میں حقیقت کے اقرار سے ان کو شرم مانع نہ آئے۔ قرآن نے اہل حق کی سب سے بڑی خوبی یہی بتائی
ہے کہ وہ حق کے اعتراف و اعلان میں ملامت کرنے والوں کی ملامت کی پروا نہیں کرتے لیکن انسانی فطرت کی کمزوریاں جس طرح
عوام کے اندر پائی جاتی ہیں اسی طرح خواص کے اندر بھی ہوتی ہیں۔ جس طرح ہمارے عوام کا پندار دینداری ان کو اس بات کی
اجازت نہیں دیتا کہ وہ تجدید ایمان کے ننگ کو گوارا کریں اسی طرح ہمارے خواص کا غرور سیادت ان کو اس بات کی اجازت نہیں دیتا
کہ وہ اپنے منہ سے خود اپنی غلط رہبری کا اقرار کریں۔ وہ ایک غلط سمت میں اتنی دور تک نکل گئے ہیں کہ ان کے لیے وہاں سے پلٹنا
آسان نہیں رہا ہے۔ یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھنی چاہیے کہ احساس دینداری کا فتنہ دنیاداری کے فتنہ سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔ جو
لوگ کسی نفس پرستی میں دنیاداری کی راہ سے مبتلا ہوتے ہیں جونہی ان کے دل پر حق کی تجلی پرتو فگن ہوتی ہے ان کی آنکھیں کھل
جاتی ہیں اور صحیح راہ ان پر آشکارا ہو جاتی ہے۔ ان کی رکاوٹیں زیادہ تر سستی اور پست ہمتی کی قسم کی ہوتی ہیں جو دل کی معمولی تنبیہ
سے بھی دور ہو جاتی ہیں لیکن جو حضرات اپنی غلطیوں کو دین و تقویٰ بنا کر ان کی پرستش کرتے اور کراتے رہتے ہیں ان کے لیے اپنے
بتوں کو توڑ پھوڑ کر ایک نیا دین اختیار کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہی تو وہ جہاد اکبر ہے جس کے اہل بہت کم نکلتے ہیں اور اس
بات پر تعجب نہیں کرنا چاہیے کہ اس کمزوری میں ہمارے علماء بھی مبتلا ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کے لیے آزمائشیں رکھی ہیں جو
[illegible] ان کے لیے [illegible] ایک امر مخصوص ہے

[illegible] حضرات میں سے [illegible] کوئی شخص [illegible]

کا اقرار ہے کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں اسلام کا اصلی مطالبہ یہی ہے لیکن چونکہ ان کا دل اس کو ماننے پر راضی نہیں ہے اس وجہ سے اس کے خلاف کچھ باتیں بتکلف بناتے ہیں۔ اور پڑھے لکھے لوگ اگر کسی آفتاب سے زیادہ روشن حق کے خلاف بھی کچھ کہنے پر آمادہ ہو جائیں تو کچھ نہ کچھ اس میں رخنہ نکال ہی دیں گے۔ چنانچہ یہ حضرات بھی کچھ نہ کچھ باتیں پیدا ہی کر لیتے ہیں۔ اگر اصلی دعوت کے خلاف ان کو کوئی بات نہیں ملتی تو داعی کے اندر ہی کچھ عیب ڈھونڈھ نکالتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہر چند دعوت عین کتاب و سنت کی دعوت ہے لیکن داعیوں پر چونکہ بھروسہ نہیں ہے اس وجہ سے ان کے پیچھے چلنے کے بجائے فلاں اور فلاں کے پیچھے چلو جن کی دعوت میں اگرچہ غلطی ہو لیکن وہ خود متقی اور بھروسہ کے قابل ہیں۔ یہ کتنی دردانگیز اور دل شکن بات ہے کہ ان لوگوں نے اشخاص کو حق کی جگہ دے رکھی ہے۔ جہاں وہ جاتے ہیں حق ان کے ہمرکاب ہوتا ہے اگرچہ وہ کعبہ کی جگہ کنشت ہی کی راہ اختیار کریں۔ عصبیت جاہلیت کی اس سے زیادہ گھنونی مثال اور کیا ہو سکتی ہے! حق پرستی کا تقاضا تو یہ تھا کہ اگر حق یہی ہے جو ہم کہہ رہے ہیں اور اس کے قبول کرنے میں محض ہماری کمزوریاں ان کے لیے رکاوٹ بنی ہوئی ہیں تو یہ خود اس کے داعی بنتے اور آگے چلتے۔ ہم انشاء اللہ ان کے پیچھے چلنے میں کوئی عار نہ محسوس کرتے لیکن یہ عجیب و غریب منطق ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ یہ دیدہ و دانستہ ایک غلط راہ پر چل سکتے ہیں بشرطیکہ اس کا داعی ان کے خیال کے مطابق دیندار ہو اور ایک صحیح راہ پر جس کی صحت کا ان کو خود اقرار ہے وہ نہیں چل سکتے کیونکہ اس کے داعی پر اصطلاحی دینداری کا لیبل نہیں چسپاں ہوا ہے۔ یہ حضرات کیتھولک چرچ کی طرح اپنے حلقہ سے باہر دینداری کا وجود شاید تسلیم نہیں کرتے ورنہ ظاہر ہے کہ اپنی اس منطق کی حمایت میں وہ کوئی دلیل نہیں پیش کر سکتے اور ہمیں یقین ہے کہ وہ اپنے اس پوزیشن پر خود بھی مطمئن نہیں ہیں اور جلد ان پر ان کی غلطی واضح ہو جائے گی۔ اگر آج نہیں تو کل کو وہ دیکھ لیں گے کہ حقیقت شخصی اور گروہی عصبیتوں سے کتنی بے نیاز ہے اور انسان حق کی جگہ اشخاص کو اپنا قبلہ و کعبہ بنا کر صرف اپنا نقصان کرتا ہے نہ کہ حق کا۔

سیاسی جماعتوں کی طرف سے مشکلات عوام کی بے پروائی اور علماء کی بے نیازانہ روش کے ساتھ ساتھ بعض سیاسی جماعتوں کا بھی آپ نے گلہ کیا ہے۔ ان جماعتوں کی مخالفت آپ کے ساتھ بالکل قدرتی ہے۔ ہمارے مقاصد اور ان کے مقاصد ایک دوسرے کے بالکل ضد واقع ہوئے ہیں۔ ہماری کامیابی اور ترقی میں درحقیقت ان کی موت مضمر ہے اس وجہ سے اگر وہ ہم کو اچھی طرح سمجھتی ہیں اور ساتھ ہی اپنے آپ کو بھی سمجھتی ہیں تو ان کو ہمارا دوست نہیں دشمن ہی ہونا چاہیے اور ہمیں ان کی طرف سے سب کچھ برداشت کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ وقت کی سیاسی جماعتوں میں سے کوئی جماعت ایسی نہیں ہے جس پر ہمارے لٹریچر اور ہماری دعوت کی زد براہ راست نہ پڑتی ہو۔ آپ نے ان میں سے ہر ایک کے کام کو غلط کہا ہے اور ہر ایک کے وجود کو باطل قرار دیا ہے پھر آپ کیوں توقع رکھتے ہیں کہ وہ آپ کو پیار کریں گی۔ سیاسی جماعتیں زندگی کے کارزار میں جدوجہد کرتی ہیں۔ اپنے حریفوں کو توڑ دینا یا اپنا لینا ان کی فطرت ہے۔ ان سے کسی مرنجان مرنج پالیسی کی امید کرنا بالکل غلط ہے۔ لیکن اس بات کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ آپ ان کی مخالفانہ روش سے اندیشہ ناک ہوں۔ ہر مخالفت ڈرنے کی چیز نہیں ہوتی۔ مخالفت صرف وہ وزنی اور قابل لحاظ ہوتی ہے جو کسی اصول کے ساتھ کسی بااصول جماعت کی طرف سے ظاہر ہو۔ مجھے مسلمانوں میں کسی ایسی جماعت کا پتہ نہیں جس کا کوئی اصول ہو۔ ان کی حیثیت سیلاب میں بہنے والے تنکوں سے زیادہ نہیں ہے۔ باطل بھی، اگر اس کی پشت پر شجاعت و ہمت ہو اور اس کے قول و فعل میں مطابقت ہو تو ایک طاقت بن جاتا ہے لیکن یہ حق نما باطل تو ایک لمحہ بھی میدان

میں نہیں ٹک سکتے جو ہماری سیاسی جماعتیں لے کر چلی ہیں۔ ان کی کمزوریاں خود ان پر واضح ہیں اور اگر ابھی حقیقت کے واضح ہونے میں کچھ کسر رہ گئی ہے تو میں پیشگوئی کرتا ہوں کہ زمانہ جلد یہ کسر بھی پوری کر دے گا۔ اور وہ دن دور نہیں ہے جب یہ ساری جماعتیں اپنی ہستی باقی رکھنے کے لیے اس بات پر مجبور ہوں گی کہ ہماری سکھائی ہوئی بولیوں میں سے کسی نہ کسی بولی کو اختیار کریں۔ اور اپنے کھوٹے سکوں کو ہمارے کھرے سکوں کے ساتھ ملا کر چلانے کی کوشش کریں۔ آپ حضرات میں سے جو لوگ وقت کے حالات پر نظر رکھتے ہیں وہ میری اس پیشگوئی کی تصدیق کریں گے کیونکہ ہمارے بہت سے الفاظ اب مختلف جماعتوں نے استعمال کرنے شروع کر دیے ہیں اور ان الفاظ کی ذہبی کشش سے وہ اپنی گرتی ہوئی پوزیشن سنبھالنا چاہتی ہیں۔ ہمارے بعض ارکان اس صورت حال کو تشویش کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اگر ہماری اصطلاحات ان جماعتوں نے اختیار کرلیں تو بہت جلد عوام کے ذہنوں میں ان اصطلاحات کا ایسا غلط مفہوم راسخ ہو جائے گا کہ اس کی اصلاح کے لیے ہم کو علٰحدہ جدوجہد کرنی پڑے گی نیز لوگوں میں یہ خیال پھیل جائے گا کہ ہم بھی وہی کچھ چاہتے ہیں جو یہ جماعتیں چاہتی ہیں لیکن مجھے اس بات سے کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ میں اس میں جماعت کے لیے کوئی خطرہ نہیں دیکھتا۔ البتہ یہ جماعتیں، اگر ان اصطلاحات کے استعمال میں نیک نیت نہیں ہیں بلکہ محض عوام فریبی کے لیے استعمال کر رہی ہیں تو مجھے خود ان کی موت اس میں نظر آتی ہے۔ اس وقت جب کہ ہمارا کام جاری ہے، ہمارا لٹریچر پوری تیزی کے ساتھ پھیل رہا ہے اور ہم خواص سے گذر کر عوام کے ذہنوں کے قریب بھی آنے کی کوشش کر رہے ہیں ہمیں اس کا ڈر نہیں ہے کہ لوگ ہماری اصطلاحات کی آڑ میں پناہ لے لیں گے۔ زیادہ زمانہ نہیں گذرے گا کہ ہماری باتیں کوچوں سے گونجیں گی اور گلیوں میں پکاری جائیں گی اور عامی سے عامی بھی ان کا وہی مفہوم سمجھے گا جو ہم سمجھانا چاہتے ہیں گے۔ اس وقت کسی کے لیے بھی یہ ممکن نہ ہوگا کہ ان پردوں میں چھپ سکے۔ یا تو لوگوں کو اس حقیقت کا صاف صاف اقرار کرنا پڑے گا جو ہم پیش کر رہے ہیں یا میدان سے ہٹنا پڑے گا۔ ابھی ہم یا تو اپنی پوری بات کہہ نہیں سکے ہیں یا لوگ سمجھ نہیں سکے ہیں اس وجہ سے دھوکا کھانے اور دھوکا دینے دونوں کا امکان ہے لیکن ان سارے امکانات کے سدباب کی تدبیریں ہم کر رہے ہیں۔ اور ہم کو یقین ہے کہ انشاء اللہ ہم ہی فتحمند رہیں گے۔ سنۃ اللہ یہ ہے کہ جب تک حق میدان میں نہیں آتا باطل کو جینے کی مہلت ملتی ہے لیکن جب وہ میدان میں اتر آتا ہے تو اللہ تعالیٰ غلبہ اسی کو دیتا ہے۔ میں مسلمانوں کی موجودہ سیاسی اور مذہبی جماعتوں میں سے کسی میں یہ صلاحیت نہیں دیکھتا کہ وہ ہماری بنائی ہوئی گولیوں کو ہضم کر سکے۔ ان میں سے کسی جماعت کا نہ کوئی سیاسی فکر ہے نہ کوئی اصول کار۔ اور نہ ان میں سے کسی کے پاس وہ کیرکٹر ہے جو جماعتوں کو فتح دلاتا ہے۔ اہل باطل میں وہ قابلیتیں موجود رہیں جن کا مظاہرہ نازیوں، اشتراکیوں اور جمہوریت کے علمبرداروں نے کیا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ حق کے ان مدعیوں میں، جو اسلام جیسے عظیم الشان حق کا نام لیتے ہیں، آج کوئی قوت و قابلیت موجود نہیں ہے۔ ان کی ہستی تمام تر دوسروں کے مستعار بلکہ مسروقہ الفاظ پر قائم ہے۔

خلافت راشدہ کے متعلق ایک عام غلط فہمی

حضرات! آپ میں سے بعضوں نے یہ سوال بھی اٹھایا ہے کہ جماعت اسلامی کے پیش نظر جو نصب العین ہے وہ بہترین ہاتھوں میں بھی ۳۰ سال سے زیادہ قائم نہ رہ سکا تو آج وہ لوگ کہاں سے آئیں گے جو اس نظام کو قائم کر سکیں گے اور ان کے ہاتھوں میں یہ زیادہ عرصہ تک قائم رہ سکے گا۔ اگرچہ آپ میں سے چند ہی حضرات نے یہ سوال

دکھایا ہے لیکن یہ ایک عام شبہ ہے جو بہت سے دلوں میں موجود ہے اور اسی کی وجہ سے بہت لوگوں کو یہ یقین ہے کہ دور قدیم سا [illegible] نظام کا قیام ناممکن ہے اور اگر ممکن ہے بھی تو یہ ایک سعی لا حاصل ہے کیونکہ جب بہترین انسانوں کے ہاتھوں [illegible] قلیل زمانہ تک قائم رہ سکا تو آج ادھر سے قیام و بقا کے متعلق کیا توقعات کی جا سکتی ہیں۔

ہمیں نہایت افسوس ہے کہ یہ باتیں آج وہ لوگ بھی کہتے ہیں جو کلمہ [illegible] شامل ہیں۔ انہیں شاید اس بات کی خبر نہیں ہے کہ ان کا کہنا درحقیقت اسلام کے خلاف دعوت دینا ہے۔ اگر اسلامی نظام [illegible] یہ نظری کمزوری موجود ہے اور وہ بہترین انسانوں کے ہاتھوں میں بھی چند دنوں سے زیادہ قائم نہیں رہ سکتا تو نہ صرف اسلامی نظام کے تصور سے استعفا دے دینا چاہیے بلکہ نفس اسلام سے بھی مایوس ہو جانا چاہیے کیونکہ اسلام کی زندگی [illegible] کے نظام سے باہر تصور نہیں کی جا سکتی۔ یہ ایک ایسی بات ہے جو کسی مسلمان کے دل میں تو کبھی اس فاسد خیال کا گذر بھی نہ ہونا چاہیے لیکن آپ نے ملاحظہ کیا کہ یہ شبہ عام طور پر لوگوں کے دلوں میں موجود ہے اور اسی کی وجہ سے اسلامی نظام کے قیام کی طرف سے لوگوں میں ایک عام افسردگی اور بددلی پائی جاتی ہے اس وجہ سے ضروری ہے کہ اس غلط فہمی کا ازالہ کیا جائے۔

حضرات! آپ کو معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم سے یہ مطالبہ نہیں کیا ہے کہ تم [illegible] کی حکومت کی طرز پر ایک حکومت قائم کرو۔ [illegible] بندوں کو اس بات کی [illegible] البتہ یہ مطالبہ ضرور کیا ہے کہ تم اقامت دین کے لیے جدوجہد کرو اور اس جدوجہد میں اپنا سب کچھ [illegible] زندگی لگا دو۔ جان بھی اور مال بھی اور اپنی تمام مرغوبات و محبوبات بھی۔ اور دین سے مراد [illegible] کوئی جزء [illegible] خواہ وہ کتنا ہی اہم کیوں نہ ہو بلکہ دین بحیثیت مجموعی مراد ہے۔ اس کے کلیات بھی اور جزئیات بھی، عقائد بھی اور اعمال بھی۔ یہ جدوجہد پورے عشق اور پورے جوش کے ساتھ مطلوب ہے اور اللہ کے نزدیک یہی چیز ہمارے ایمان اور وفاداری کی کسوٹی ہے۔ [illegible] جو اس ولولہ سے خالی ہو ایمان [illegible] نہیں بن سکتا اور کوئی دل جو اس درد سے ناآشنا ہو خدا کا محبوب نہیں ہو سکتا۔ کتنی ہی تسبیحیں گردانی جائیں، کتنے ہی وظیفے پڑھے جائیں اور کتنی ہی عمریں لگائی جائیں اس عشق کے بدل نہیں ہو سکتے۔ ساری دینداری کی روح یہی ہے اور خدا کے ہاں ہمارے دلوں کے اندر سب سے پہلے یہی چیز ڈھونڈی جائے گی۔ اور یہ بھی ایک ضروری شرط ہے کہ یہ جدوجہد اجتماعی شکل میں ہو، انفرادی شکل میں نہ ہو۔ ہر مرد حق کا فرض ہے کہ وہ اپنے اندر اس کی گرمی پیدا کرے اور پھر یہ کوشش کرے کہ اس آگ سے سارے دل بھڑک اٹھیں۔ یہ سوال بحث سے خارج ہے کہ یہ جدوجہد کس حد تک نتیجہ خیز ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ ہم آروں سے چیر ڈالے جائیں، گلیوں میں گھسیٹے جائیں، آنکھوں پر پٹیاں باندھی جائیں اور ہمارے جسموں کو [illegible] نوچیں اور ان ساری باتوں کے بعد بھی ہمیں یہ سعادت حاصل نہ ہو سکے کہ ہم موجودہ نظام باطل کو ایک نظام حق سے بدل دیں لیکن نہ تو یہ ناکامی [illegible] اور نہ اس کا اندیشہ بلکہ اس کا یقین بھی ہم کو اس مطالبہ سے سبکدوش [illegible] جو خدا نے اقامت دین کے لیے ہم سے کیا ہے۔ وہ تو ایک مستقل فرض ہے جو ہر قیمت پر اور ہر حال میں ادا کرنا ہے۔ اگر ہندوستان کی تمام [illegible] بھی آپ کو یہ اطمینان دلانے کی کوشش کریں کہ فلاں فلاں [illegible] اور اس ذمہ داری سے سبکدوش [illegible] تو یہ آپ کا [illegible]

کے دین کی عمارت کی ایک ایک اینٹ بھی اپنی جگہ سے ہٹی ہوئی ہے اور خدا کی زمین کا ایک ٹکڑا بھی غیر اللہ کی اطاعت کے نیچے دبا ہوا ہے اس وقت تک آپ کے لیے چین کی نیند حرام ہے۔

اس جدوجہد کے انجام کی نسبت ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کہ کیا ہوگا۔ انجام کا حال صرف اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے۔ اگر اس جدوجہد کا نتیجہ یہ ہو کہ ہم ایک صالح نظام قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو یہ اللہ تعالیٰ کا انعام ہوگا۔ بعض لوگ طنز سے یہ کہتے ہیں کہ ہماری ساری جدوجہد حکومت کے لیے ہے اور خدا کی رضا کی طلب جو مقصود دین ہے ہمارے سامنے نہیں ہے۔ یہ خیال بالکل غلط ہے۔ ہماری ساری جدوجہد اللہ کے دین کے قیام اور ایک صالح اور خدائی نظام کی اقامت کے لیے ہے اور یہ جدوجہد کوئی جرم نہیں ہے جس پر ہمیں شرمانے کی ضرورت ہو اور ہم جب کبھی حکومت الٰہیہ کا نام لیتے ہیں تو اس سے ہماری مراد یہی نظام ہوتا ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ اس کے مطلوب و محبوب ہونے میں کس پہلو سے بحث کی جا سکتی ہے اور آخر یہ خدا کی رضا طلبی سے الگ چیز کیوں ہے؟ خدا کی رضا اس سے بڑھ کر کس بات میں ہو سکتی ہے کہ اس کی زمین پر اس کے احکام چلیں اور ان لوگوں سے بڑھ کر رضائے الٰہی کا طالب کون ہو سکتا ہے جو اس بات کے لیے سردھڑ کی بازی لگا دیں کہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو خدا کی زمین پر غیر اللہ کے اقتدار کا کوئی دھبہ نہ رہنے دیں گے۔ اگر یہ جدوجہد دنیاداری ہے تو کیا دینداری یہ ہے کہ راتوں میں جاگ کر اللہ ہو کی ضربیں لگائی جائیں اور دن میں خدا کی زمین پر شیطان کا تخت بچھانے کی کوشش کی جائے۔ جو لوگ اس طرح کی باتیں کہتے ہیں ان کے ذہنوں میں دین کا نہایت ناقص تصور ہے اور بہتر ہے کہ انھیں ابھی اس بات کے لیے مہلت دی جائے کہ وہ دین کی اصل حقیقت سمجھ سکیں۔

اگر صحیح اسلامی نظام صرف ۳۰ سال ہی قائم رہا جب بھی یہ ایسی چیز ہے جس کے لیے اگر ہم اپنی زندگیاں مٹا دیں تو یہ مہنگا سودا نہیں ہے بلکہ اس نظام خیر و برکت کی ایک شب بھی جس میں خدا کا بندہ صرف خدا کا محکوم رہتا ہے ان ہزاروں مہینوں سے افضل ہے جن میں خدا کے بندوں کو خدا کے سوا دوسروں کی غلامی کرنی پڑتی ہے۔ آپ ۳۰ سال کہتے ہیں میں تو اس کے ۳۰ منٹ بھی بہت سمجھتا ہوں اور اپنی اور اپنی جیسی لاکھوں زندگیوں کو اس کی قیمت نہیں سمجھتا۔ ذرا غور تو کیجیے، دنیا کی تمام سیاسی تنظیمات میں سب سے افضل جمہوریت کو سمجھا جاتا ہے لیکن اس کی نسبت قطعیت کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ محض ایک امکان ہے نہ واقعہ کی صورت میں ایک لمحہ کے لیے بھی اس کا وجود ہوا، نہ کبھی اس کا تصور کیا جا سکتا ہے تاہم آپ دیکھتے ہیں کہ اس کے لیے دنیا نے کتنی شاندار قربانیاں دی ہیں۔ پھر ایک ایسے نظام کے قیام کی طرف سے آپ کیوں بددل ہوتے ہیں جو عملاً دنیا میں خود آپ کے اقرار کے مطابق ۳۰ سال تک قائم رہ چکا ہو اور جس کے امن و عدل اور خیر و برکت پر مومن و منکر دونوں کی شہادت موجود ہے۔

لیکن یہ تاریخ کے نہایت ناقص مطالعہ کا نتیجہ ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ صحیح اسلامی نظام صرف ۳۰ سال ہی قائم رہا۔ بصیرت کی کمی کی وجہ سے اشخاص کی تبدیلی اور نظام کی تبدیلی میں لوگ فرق نہیں کرتے حالانکہ دونوں باتوں میں آسمان و زمین کا فرق ہے۔ خلافت راشدہ کے خاتمہ کے بعد جو تبدیلی واقع ہوئی وہ کانسٹی ٹیوشن کی تبدیلی نہیں تھی بلکہ اشخاص اور افراد کی تبدیلی تھی۔ ملک کا قانون وہی رہا، حکومت کا دستور وہی رہا، تعزیرات خدا کی قائم کی ہوئی تھیں، حدود اللہ کے مقرر کیے ہوئے تھے

جائدادیں قرآن کے بتائے ہوئے قانون کے مطابق تقسیم ہوتی تھیں۔ صرف اس نظام کے چلانے والے افراد میں یہ تبدیلی ضرور ہو گئی تھی کہ وہ صدیق اکبر اور فاروق اعظم کی طرح متقی اور خدا ترس نہ تھے۔ تاہم ان میں سے کسی کے لیے بھی یہ ممکن نہ تھا کہ خدا کے قانون کی جگہ اپنا قانون چلادے۔ ان میں سے اگر کوئی شخص خدا کے کسی حکم کی ذمہ داریوں سے بچنا چاہتا تھا تو اس کو طرح طرح کے مذہبی حیلوں سے کام لینا پڑتا تھا۔ خدا سے علانیہ بغاوت ان میں سے بدسے بدتر آدمی بھی کرنے کی جرأت نہ کرتا تھا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ بعد کے زمانوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ جب مسند خلافت پر کوئی خدا ترس اور متقی انسان آگیا تو دفعۃً شب بُرُدز کے اندر دنیا میں وہ بہار آگئی جو فاروق اعظم کے زمانہ میں آئی تھی اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ گویا نظام حکومت میں سرے سے کوئی خرابی پیدا ہی نہیں ہوئی تھی۔ اور یہ واقعہ بھی ہے کہ دراصل نظام کے اندر کوئی بنیادی خرابی، جس کی اصلاح دیرطلب ہو، پیدا بھی نہیں ہوئی تھی۔ صرف اُوپری خرابیاں پیدا ہوتی تھیں جو معمولی تبدیلی سے درست ہو جاتی تھیں۔ اس طرح کی اصلاح کے دور اسلامی خلافت پر بار بار آئے اور جب تک اس کی بنیاد میں خرابی نہیں پیدا ہوئی یعنی خدا کی حکومت کی جگہ طاغوت کی حکومت نہیں قائم ہو گئی اس وقت تک دنیا میں خلافت راشدہ کی برکتوں کا دور بار بار آتا رہا اور اب بھی اس کے لیے جدوجہد کی جائے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کام میں ہماری مدد کیوں نہ فرمائے گا۔ اس آسمان کی چھت کے نیچے ہر طرح کے کام ہو رہے ہیں اور جن کاموں کے لیے وہ جدوجہد ظہور میں آجاتی ہے جو ان کے لیے مطلوب ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ کام بھی ہو جاتے ہیں۔ خواہ باطل ہوں یا حق۔ پھر جب اس کائنات کا رب اہل باطل کی جاں بازیوں کو بھی نامراد نہیں کرتا تو آخر ایک مقصد حق ہی سے اس کو اتنی عداوت کیوں ہو گی کہ اس کے لیے اگرچہ سر دھڑ کی بازی لگانے والے پیدا ہو جائیں لیکن وہ پورا نہ ہو سکے گا۔

کام کے ضروری شرائط لیکن ہر کام کا ایک مخصوص طریقہ ہوتا ہے، اور ضروری ہے کہ اس کو اسی طریقہ پر انجام دیا جائے۔ ایک کام کو اگر آپ غلط طریقہ پر کر رہے ہیں تو خواہ یہ غلطی آپ کتنی ہی نیک نیتی سے کریں اس غلطی کا نتیجہ اس عمل کی ناکامی کی شکل میں آپ کے سامنے آکے رہے گا۔ خدا کے بنائے ہوئے قوانین بالکل بے لوث اور بے لاگ ہوتے ہیں۔ نیک سے نیک انسان بھی اگر شہد کی جگہ حنظل استعمال کر رہا ہے تو اس کی نیکی کی وجہ سے حنظل میں شہد کی تاثیر نہیں پیدا ہو جائے گی۔ اسی طرح اگر مسلمان ایک کام کو غلط طریقہ پر کر رہے ہیں تو اس وجہ سے کہ وہ مسلمان ہیں اور اپنے زعم میں خدا کے ہاں بڑا درجہ رکھتے ہیں، یہ نہیں ہو سکتا کہ ان کا کام صحیح ہو جائے۔ اور اگر غیر مسلم کسی کام کو صحیح طریقہ پر انجام دینے کی جدوجہد میں سرگرم ہیں تو محض اس وجہ سے کہ وہ غیر مسلم ہیں یہ نہیں ہو سکتا کہ ان کی صحیح جدوجہد کا نتیجہ نہ ملے۔ اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے قوانین میں اس طرح کی ناانصافی نہیں ہے۔ مسلمانوں میں یہ احساس بڑی شدت کے ساتھ پایا جاتا ہے کہ بحیثیت مسلمان کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکومت و اقتدار کی نعمت پانے کے مستحق وہی ہیں۔ اس احساس کے ساتھ جب وہ اپنی موجودہ حالت پر نظر ڈالتے ہیں تو ان کو قرآن کے وعدوں اور خدا کی طرف سے مایوسی ہونے لگتی ہے۔ وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ جب ہم مسلمان ہیں تو زمین کی وراثت ہمیں کو ملنی تھی۔ اگر نہیں ملی تو اس میں ان کا کوئی قصور نہیں ہے بلکہ وعدہ کرنے والے ہی کی طرف سے کوئی تغافل ہے۔ لیکن یہ خیال نہایت غلط ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کا وعدہ انفرادی کوششوں کے صلہ میں فرمایا ہے ان کو

انفرادی کوششوں کے صلہ میں عطا فرماتا ہے لیکن جن چیزوں کا وعدہ جماعت سے ہے ان کے لیے ضروری ہے کہ جماعتی جدوجہد ظہور میں آئے، اگر ان کے لیے جماعتی جدوجہد ظہور میں نہ آئے تو خواہ انفرادی زہد و تقویٰ میں آپ کتنے ہی بڑھے ہوئے ہوں، آپ کے اندر جنید و شبلی اور سلمان و ابوذرؓ کے درجہ کے متقی بھی کیوں نہ موجود ہوں لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ ان انفرادی نیکیوں کے صلہ میں آپ کو اللہ تعالیٰ کے وہ انعامات مل جائیں جو جماعتی نیکیوں کے لیے مخصوص ہیں۔ ہم کو اس امر سے انکار نہیں ہے کہ مسلمانوں میں آج بھی نہایت نیک اور صالح افراد موجود ہیں لیکن ان نیک اور صالح افراد نے مل کر کبھی اس بات کی کوشش نہیں کی کہ اس ملک میں ایک صالح نظام قائم کریں بلکہ اپنی انفرادی نیکیوں کے زعم میں ہمیشہ خدا سے شکوہ سنج رہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے اپنے وعدے پورے نہیں کیے۔ خدا نے جماعتوں سے ان کی جماعتی نیکیوں پر جو وعدے فرمائے ہیں وہ تو اس قدر اٹل ہیں کہ اگر وہ نیکیاں کسی جماعت کے اندر خدا کے انکار کے ساتھ بھی پیدا ہو جائیں جب بھی وہ صلے مل کر رہتے ہیں۔ پھر اگر کوئی جماعت ایمان و اسلام کی نعمت سے بہرہ ور ہو کر ایک صالح نظام کے لیے جدوجہد کرے تو کوئی وجہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے انعامات سے اس کو محروم فرمائے۔

جماعت اسلامی مسلمانوں کی اس غلطی کی اصلاح کر رہی ہے۔ وہ قوم کے تمام صالح افراد کو منظم کر کے چاہتی ہے کہ ان کو ایک صالح نظام کے قیام کی جدوجہد میں لگائے اور اس کام کو انجام دینے کا جو صحیح طریقہ ہے اس طریقہ پر انجام دے۔ اگرچہ انجام بہرحال اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے لیکن ہمیں خدا کی ذات سے یہی امید ہے کہ ہماری جدوجہد کامیاب ہوگی اور ہم منزل مقصود تک پہنچ کے رہیں گے لیکن ایک طویل زمانہ تک جماعتی زندگی سے محروم رہنے کی وجہ سے ہم جماعتی زندگی کی خصوصیات اور ذمہ داریوں سے بالکل ناآشنا ہو گئے ہیں اس وجہ سے نہایت ضروری ہے کہ آج جب کہ ہم جماعتی زندگی کا ارادہ کر رہے ہیں اس کی ذمہ داریوں کو سمجھنے اور ادا کرنے کا اہتمام کریں۔

جماعتی زندگی کی خصوصیات

جماعتی زندگی کی سب سے بڑی امتیازی خصوصیت ڈسپلن اور جماعتی نظم کی پابندی ہے۔ جماعت وجود ہی میں اس نظم کی پابندی کے ارادہ سے آتی ہے اس وجہ سے اس سے ادنیٰ بے پروائی جماعت کی موت کے مرادف ہے۔ اس نظم کو قائم رکھنے کے لیے جماعت کے تمام افراد کو اپنی ذاتی خواہشوں اور انفرادی رایوں کی قربانی کرنی پڑتی ہے۔ اس زندگی میں کسر و انکسار شرط ضروری ہے۔ افراد بکھری ہوئی اینٹوں کے مانند ہیں ان کو ایک عمارت کی صورت اختیار کرنے کے لیے لازماً اس بات پر آمادہ ہونا پڑتا ہے کہ تھوڑا سا زخم گوارا کریں۔ اگر ہر اینٹ اس بات پر اصرار کرے کہ وہ کوئی زخم گوارا نہ کرے گی تو عمارت نہیں بن سکے گی۔ اسی طرح اگر آپ میں سے ہر فرد اپنی رائے پر اصرار کرے اور اپنی آزادی میں کسی قسم کی مداخلت نہ گوارا کرے تو جماعت نہیں بن سکتی اور اگر بن جائے گی تو قائم نہ رہ سکے گی۔ یہ نہیں خیال کرنا چاہیے کہ جماعتی زندگی آزادی رائے کو برباد کرنے والی چیز ہے۔ بے شک اس کے لیے آدمی کو اپنی آزادی کا ایک حصہ قربان کرنا پڑتا ہے لیکن اس تھوڑے حصہ کو قربان کر کے آدمی اپنی پوری آزادی کو محفوظ کر لیتا ہے۔ اور اگر کوئی شخص اس تھوڑی قربانی پر آمادہ نہیں ہوتا تو اسے اپنی پوری آزادی کھونی پڑتی ہے۔ جس طرح ایک خزانہ کا مالک اگر اپنے خزانہ کا کچھ حصہ پہرہ داروں اور پاسبانوں کی نذر نہ کرے تو اس کا پورا خزانہ خطرہ میں رہتا ہے اسی طرح افراد کی ساری آزادی خطرہ میں ہے اگر وہ جماعت کے حق میں اپنی آزادیٔ رائے کو ایک حد تک قربان کرنے پر آمادہ نہ ہوں۔ آپ کی رپورٹوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابھی ہم میں اس شعور کی کمی ہے۔ کوشش کیجیے کہ لوگوں میں یہ شعور پیدا ہو

اس کا پیدا ہونا محض ایک اخلاقی فضیلت نہیں ہے بلکہ ایک اہم دینی ضرورت ہے اور جن لوگوں کے اندر اس چیز کی کمی ہے وہ اس کی تلافی اس کو پورا کر کے ہی کر سکتے ہیں۔ نوافل کی کوئی مقدار اس کا بدل نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ جماعتی نظم میں فساد پیدا کرنے والوں کے لیے اسلام میں نہایت سخت سزا ہے۔ جو لوگ اس چیز میں کوئی خرابی ڈالتے ہیں وہ اپنی ساری نماز روزہ کا ثواب کھو بیٹھتے ہیں۔ پس میں ارکان جماعت کو نصیحت کرتا ہوں کہ وہ اس معاملہ میں ادنیٰ غفلت کو بھی راہ نہ دیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے پھر عرض کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے جو وعدے جماعت سے ہیں وہ افراد کے لیے نہیں ہیں درست ہوا تو اور اسلام کوئی ایسا دین نہیں ہے جس کے مطالبات انفرادی زندگی سے پورے ہو سکیں خواہ ان پر کتنی ہی تقویٰ اور دینداری سے عمل کیا جائے۔

اسی کے ساتھ ساتھ ایک اور امر بھی قابل لحاظ ہے۔ وہ یہ ہے کہ دین کے بعض جزئیات کے متعلق مسلمانوں کے مختلف گروہوں میں خواہ مخواہ کی ایک مبالغہ آمیز عصبیت پیدا ہو گئی تھی۔ اور اس عصبیت کی شدت و خشونت اس درجہ بڑھی ہوئی تھی کہ ان جزئیات کے لیے لوگ کٹنے مرنے تک لگ گئے تھے اور ان کا تناسب اس قدر قوی ہو گیا تھا کہ ان کے آگے اصل دین کے سارے مطالبات دب گئے تھے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے بعض ارکان میں اب بھی یہ پرانا مذاق کچھ نہ کچھ باقی ہے جس کے سبب سے اندیشہ ہوتا ہے کہ مبادا اس نظم جماعت کو نقصان پہنچ جائے۔ ضرورت ہے کہ آپ اصل اور فرع میں امتیاز پیدا کریں اور شاخوں کی آبیاری میں اس درجہ منہمک نہ ہو جائیں کہ درخت کی جڑ سوکھ کے رہ جائے۔ دین کا ایسا شعور اپنے اندر توازن پیدا کرے اور ہر چیز کو اس کی اصلی جگہ دینے کا مذاق پیدا کرے نہایت ضروری ہے۔ اگر آپ جزئی آراء ہی میں الجھ گئے تو گویا آپ نے فروع کو اصل بنا کر اس کی خاطر ساری جماعت اور سارے دین کو خطرہ میں ڈال دیا۔

اسی سلسلہ میں ایک اور بات پر بھی تنبیہ نہایت ضروری ہے وہ یہ کہ اس دور میں لوگوں کے ذہنوں میں دینداری کا ایک غلط تصور پیدا ہو گیا ہے کہ جب کسی دینی کام کا ارادہ کیا جائے لوگ اس کے کارکنوں میں ایسی باتیں ڈھونڈنے لگتے ہیں جن کی دین میں کوئی اصل نہیں ہے۔ اور جب وہ چیزیں نہیں پاتے تو پوری جماعت کو ایک غیر دینی جماعت بلکہ ایک منکرہ جماعت قرار دیتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ بہت سے لوگ یہ کہتے ہیں کہ جماعت اسلامی اپنے مقاصد کے اعتبار سے نہایت صالح اور نہایت اچھی جماعت ہے لیکن اس کے لیڈروں میں تقویٰ نہیں ہے۔ چونکہ اس پروپیگنڈے سے کچھ ذہنی طور سے ہمارے ارکان بھی متاثر ہونے ہیں۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ بعض باتیں اس سلسلہ میں بھی گوش گزار کر دی جائیں۔ اور ان باتوں سے مقصود اپنے آپ کو محفوظ کرنا نہیں بلکہ اصل حقیقت کا اظہار مقصود ہے۔ اس جماعت کے لیڈروں میں سے کسی کو بھی تقویٰ کا دعویٰ نہیں ہے البتہ ان حضرات کے تقویٰ پر حیرت ضرور ہے جو صحیح کام جماعت اسلامی کے کام کو سمجھتے ہیں لیکن ہمارے اندر تقویٰ کی کمی کی وجہ سے عام مسلمانوں کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ ان لوگوں کے پیچھے چلو جو اگرچہ غلط راہ پر جا رہے ہیں لیکن متقی ہیں۔ ہم ان کو خدا کا واسطہ دے کر ان کی ذمہ داری یاد دلاتے ہیں کہ اگر ان پر راہ حق واضح ہے اور ان میں تقویٰ بھی موجود ہے تو وہ خود آگے بڑھ کر زمام قیادت اپنے ہاتھوں میں لیں لیکن دیدہ و دانستہ مسلمانوں کو غلط راہ پر چلنے کا مشورہ نہ دیں۔ انھیں اس بات کو یاد رکھنا چاہیے کہ اس تقویٰ کے لیے ایک روز حساب بھی ہے جس دن ان سے مسلمانوں کو دیدہ و دانستہ غلط مشورہ دینے کی بابت پرسش ہوگی اور وہ اس جواب سے بری نہ ہو سکیں گے کہ انھوں نے مسلمانوں کو متقی غلط کاروں کے پیچھے گمراہ ہونے کا مشورہ دیا۔

میں اس موقع پر پورے اطمینان قلب کے ساتھ یہ حقیقت بھی واضح کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ اس زمانہ میں تقویٰ کے جو لوازم پیدا ہو گئے ہیں تقویٰ کے موسم بہار یعنی خیر القرون میں ان لوازم کا کوئی نام و نشان بھی نہ تھا۔ موجودہ تقویٰ میں صرف یہ کافی نہیں ہے کہ حرام کو حرام قرار دیا جائے اور آدمی اس سے پرہیز کرے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ اللہ کی مباح کی ہوئی چیزوں کا بھی تارک ہو۔ اور ستم یہ کہ بعض مباحات کے ترک کا اس درجہ اہتمام ہے کہ جہاں آدمی میں ان چیزوں کا کوئی شائبہ پایا گیا وہ رند مشہور ہوا حالانکہ بڑے بڑے محرمات صریحہ میں یہ حضرات مبتلا ہیں لیکن ان کا احساس ان حضرات کو ذرا بے چین نہیں کرتا۔ اگر ایک آدمی قرینہ کی صاف ستھری زندگی بسر کرے تو ان کی ولایت سے وہ خارج ہے لیکن طاغوت کی حمایت و نصرت میں اپنی ساری قابلیتیں رات دن صرف کرنے والے محض چند رسمیات کی پابندی کی بدولت روزانہ قرب خداوندی کے نہایت بلند مراحل و مقامات طے کرتے ہیں اور ان کے سلوک میں کوئی شے مزاحم نہیں ہوتی۔ مسیح نے شاید اسی تقویٰ کو "مچھر کو چھاننے اور اونٹ کو نگلنے" سے تعبیر کیا ہے اور کتنی سچی تعبیر ہے یہ اس تقویٰ کی جس میں ڈاڑھی اور لباس کی ادنیٰ بے قاعدگی گوارا نہیں کی جاتی لیکن خدا کی ساری شریعت کی بربادی پر ان کے سینوں میں ایک آہ بھی نہیں۔

اس عہد میں تقویٰ کے لیے ایک شرط لازم یہ بھی ہے کہ آدمی کے پاس کسی خانقاہ کی سند ہو۔ بغیر اس سند کے چاہے کوئی شخص کتاب و سنت کا کتنا ہی پابند ہو مقام تقویٰ تک نہیں پہنچ سکتا۔ حالانکہ یہ شرط دین میں ایک اضافہ ہے۔ قرآن میں جس تقویٰ کی مدح کی گئی ہے وہ حدود الٰہی کی پاسداری اور خدا کے دین کو اپنے اوپر قائم کرنے اور دوسروں کو اس کی دعوت دینے سے زیادہ کچھ نہیں۔ اگر ایک شخص اللہ کے حدود سے ڈرتا ہے، خدا کی شریعت کی پابندی کا التزام کرتا ہے، محرمات اور بدعات سے بچتا ہے تو وہ متقی ہے خواہ وہ کسی خانقاہ سے وابستہ ہو یا نہ ہو۔ ظاہرداری، خاکساری، بے قرینہ تقشف، اقامت دین کی جدوجہد سے بے پروائی، رہبانیت اور اوراد و وظائف کا انہماک اور اس قبیل کی دوسری باتیں ہمارے یہاں نہیں ہیں اور جن حضرات کو ان چیزوں کی تلاش ہے بہتر ہے کہ وہ کسی خانقاہ کی راہ لیں۔ ہم سے ان چیزوں کا مطالبہ نہ کریں۔ ہم سے انہی چیزوں کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے جن کی اصل اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت میں ہے۔ ان چیزوں کے سوا کوئی چیز ہم پر حجت نہیں قائم کر سکتی۔ میں ان باتوں کو اس لیے صاف صاف کہہ رہا ہوں کہ کسی کو ہماری نسبت کوئی غلط فہمی نہ رہے۔ ہم جتنے ہیں اس سے زیادہ ایک حرف ظاہر کرنا پسند نہیں کرتے۔

مجھے یہ حقیقت ظاہر کر دینے میں بھی کوئی باک نہیں ہے کہ آج یہ تقویٰ کے بہت سے لوازم جو پیدا کر لیے گئے ہیں وہ اقامت دین کی اصلی جدوجہد پر پردہ ڈالنے کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ ان حضرات کو جب دین کے اصلی مطالبات مشکل معلوم ہوئے اور انھیں نظر آیا کہ اس راہ میں چند مقامات بہت سخت آتے ہیں اور ساتھ ہی ان کو یہ شرمندگی بھی گوارا نہ تھی کہ ان پر قصور ہمت کا الزام آئے تو انھوں نے دین کے اصلی مطالبات کے دوسرے بدل تجویز کر لیے۔ میدان کا کام انھوں نے دنیا کو فتنہ کہہ کر چھوڑ دیا اور خانقاہوں میں بیٹھ کر اوراد و وظائف کی مقداروں میں اضافہ کر دیا۔ پھر تقویٰ کی ایک خاص ہیئت قرار پا گئی اور متقیانہ زندگی کا ایک خاص نہج وجود میں آ گیا اور آہستہ آہستہ اب یہ حال ہو گیا ہے کہ ان کے ہاتھوں میں تقویٰ کا جو پیمانہ ہے ہمیں اندیشہ ہے کہ اگر اس سے خیر القرون کے مسلمانوں کو بھی ناپا جائے تو شاید وہ بھی متقی نہ ثابت ہو سکیں۔ ہم اس

تقویٰ کے قائل نہیں ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ کافی ہے کہ ایک سیدھے سادے اور پختہ مسلمان کی سی زندگی بسر کیجیے۔ خدا اور اس کے رسول کی جو باتیں آپ کے علم میں آئیں اس پر کاربند رہیے، ان کا نقش گہرا جم جائے۔ اپنی زندگی کا برابر احتساب کرتے رہیے کہ آپ کے کام دکھاوے اور شہرت کے لیے نہ ہوں۔ اور رات دن اس جد و جہد میں لگے رہیے کہ خدا کے بندوں پر صرف خدا کا قانون حاکم ہو۔ دوسرے مدعیان حکومت یا تو مٹ جائیں یا ان کو بدلنے اور نہ بدلنے کی صورت میں ان کو مٹانے میں ہم مٹ جائیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اب ان باتوں کو آپ گوش ہوش سے سن لیں۔ زمانہ بڑی تیزی سے بدل رہا ہے۔ ہمارے سامنے نہایت مشکل کام آنے والے ہیں نہ خبر کہ ہمارے سامنے کوئی سخت امتحان آ جائے اور ہماری فوج مغالطوں میں الجھی ہوئی ہو۔ آپ کے ہاتھ میں کتاب و سنت کے سوا کوئی پیمانہ نہیں ہونا چاہیے۔ اس پیمانہ سے اپنی جماعت کے افراد کو ناپتے رہیے۔ اپنے امیر کو بھی اور ماموروں کو بھی۔ اس احتساب میں جماعت کی زندگی ہے اور اس میں کسی قسم کی مداہنت اور مسامحت سے کام نہ لیجیے دوسرے خیالات جو بے اصل ہیں ان کو چھوڑیے اور اگر ان کی گرفت آپ پر اتنی سخت ہے کہ آپ الگ نہیں ہو سکتے تو ہمیں اس بات کا کوئی غم نہ ہوگا اگر آپ ہم کو چھوڑ دیں۔ ہم نہ تو خود دھوکے میں رہنا چاہتے ہیں نہ دوسروں کو دھوکا دینا چاہتے

اجلاس ہفتم

(تاریخ ایضاً)

نماز مغرب کے بعد آخری اجلاس منعقد ہوا۔ چونکہ اب اجتماع کے سلسلہ کا سارا پروگرام اختتام کو پہنچ چکا تھا اس لیے جماعت کو رخصت کرنے سے پہلے اس اجلاس میں امیر جماعت نے رفقاء و حاضرین سے آخری خطاب کیا جو درج ذیل ہے۔

امیر جماعت کی اختتامی تقریر

حمد و صلوٰۃ اور تمہیدی فقروں کے بعد فرمایا:-

رفقاء و حاضرین۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے ہماری جد و جہد کا آخری مقصود انقلاب امامت ہے، یعنی دنیا میں ہم جس انتہائی منزل تک پہنچنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ فساق و فجار کی امامت و قیادت ختم ہو کر امامت صالحہ کا نظام قائم ہو اور اسی سعی و جہد کو ہم دنیا و آخرت میں رضائے الٰہی کے حصول کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ یہ چیز جسے ہم نے اپنا مقصد قرار دیا ہے، افسوس ہے کہ آج اس کی اہمیت سے مسلم اور غیر مسلم سبھی غافل ہیں۔ مسلمان اس کو محض ایک سیاسی مقصد سمجھتے ہیں اور ان کو کچھ احساس نہیں ہے کہ دین میں اس کی کیا اہمیت ہے۔ غیر مسلم کچھ تعصب کی بنا پر اور کچھ ناواقفیت کی وجہ سے اس حقیقت کو جانتے ہی نہیں کہ دراصل فساق و فجار کی قیادت ہی نوع انسانی کے مصائب کی جڑ ہے اور انسان کی بھلائی کا سارا انحصار صرف اس بات پر ہے کہ دنیا کے معاملات کی سربراہ کاری صالح لوگوں کے ہاتھوں میں ہو۔ آج دنیا میں جو فساد عظیم برپا ہے، جو ظلم اور طغیان ہو رہا ہے انسانی اخلاق میں جو عالمگیر بگاڑ رونما ہے، انسانی تمدن و تہذیب اور معیشت و سیاست کی رگ رگ میں جو زہر سرایت کر گئے، زمین کے تمام وسائل اور انسانی علوم کی دریافت کردہ ساری قوتیں جس طرح انسان کی فلاح و بہبود کے بجائے اس کی تباہی کیلیے استعمال ہو رہی ہیں، ان سب کی ذمہ داری اگر کسی چیز پر ہے تو وہ صرف یہی ہے کہ دنیا میں چاہے نیک لوگوں اور شریف انسانوں کی کمی نہ ہو مگر دنیا کے معاملات ان کے ہاتھ میں نہیں ہیں بلکہ خدا سے پھرے ہوئے اور مادہ پرستی و بداخلاقی

میں ڈوبے ہوئے لوگوں کے ہاتھوں میں ہیں۔ اب اگر کوئی شخص دنیا کی اصلاح چاہتا ہو اور فساد کو صلاح سے، اضطراب کو امن سے، بداخلاقیوں کو اخلاقِ صالحہ سے اور برائیوں کو بھلائیوں سے بدلنے کا خواہشمند ہو تو اس کے لیے محض نیکیوں کا وعظ اور خداپرستی کی تلقین اور حسنِ اخلاق کی ترغیب ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کا فرض ہے کہ نوعِ انسانی میں جتنے صالح عناصر اس کو مل سکیں انہیں ملا کر وہ اجتماعی قوت بہم پہنچائے جس سے تمدن کی زمامِ کار فاسقوں سے چھینی جا سکے اور امامت کے نظام میں تغیر کیا جا سکے۔

انسانی زندگی کے مسائل میں جس کو تھوڑی سی بصیرت بھی حاصل ہوگی وہ اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہو سکتا کہ انسانی معاملات کے بناؤ اور بگاڑ کا آخری فیصلہ جس مسئلے پر منحصر ہے وہ یہ سوال ہے کہ معاملاتِ انسانی کی زمامِ کار کس کے ہاتھ میں ہے۔ جس طرح گاڑی ہمیشہ اسی سمت چلا کرتی ہے جس سمت پر ڈرائیور اس کو لے جانا چاہتا ہو اور دوسرے لوگ جو گاڑی میں بیٹھے ہوں خواستہ و ناخواستہ اسی سمت پر سفر کرنے کے لیے مجبور ہوتے ہیں، اسی طرح انسانی تمدن کی گاڑی بھی اسی سمت پر سفر کیا کرتی ہے جس سمت پر وہ لوگ جانا چاہتے ہیں جن کے ہاتھ میں تمدن کی باگیں ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ زمین کے سارے ذرائع جن کے قابو میں ہوں، قوت و اقتدار جن کے ہاتھ میں ہو، عام انسانوں کی زندگی جن کے دامن سے وابستہ ہو، خیالات و افکار اور نظریات کو بنانے اور ڈھالنے کے وسائل جن کے قبضے میں ہوں، انفرادی سیرتوں کی تعمیر، اجتماعی نظام کی تشکیل اور اخلاقی قدروں کی تعیین جن کے اختیار میں ہو، ان کی رہنمائی و فرمانروائی کے تحت رہتے ہوئے انسانیت بحیثیت مجموعی اس راہ پر چلنے سے کسی طرح باز نہیں رہ سکتی جس پر وہ اسے چلانا چاہتے ہوں۔ یہ رہنما و فرمانروا اگر خداپرست اور صالح لوگ ہوں تو لامحالہ زندگی کا سارا نظام خداپرستی اور خیر و صلاح پر چلے گا، برے لوگ بھی اچھے بننے پر مجبور ہوں گے، بھلائیوں کو نشوونما نصیب ہوگا اور برائیاں اگر مٹیں گی نہیں تو کم از کم پروان بھی نہ چڑھ سکیں گی۔ لیکن اگر رہنمائی و قیادت اور فرمانروائی کا یہ اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں ہو جو خدا سے برگشتہ اور فسق و فجور میں سرگشتہ ہوں تو آپ سے آپ سارا نظامِ زندگی خدا سے بغاوت اور ظلم و بداخلاقی پر چلے گا، خیالات و نظریات، علوم و آداب، سیاست و معیشت، تہذیب و معاشرت، اخلاق و معاملات، عدل و قانون، سب کے سب بحیثیت مجموعی بگڑ جائیں گے۔ برائیاں خوب نشوونما پائیں گی اور بھلائیوں کو زمین اپنے اندر جگہ دینے سے اور ہوا اور پانی ان کو غذا دینے سے انکار کر دیں گے۔ اور خدا کی زمین ظلم و جور سے لبریز ہو کر رہے گی۔ ایسے نظام میں برائی کی راہ پر چلنا آسان اور بھلائی کی راہ پر چلنا کیا معنی قائم رہنا بھی مشکل ہوتا ہے۔ جس طرح آپ نے کسی بڑے مجمع میں دیکھا ہوگا کہ سارا مجمع جس طرف جا رہا ہو، اس طرف چلنے کے لیے تو آدمی کو کچھ قوت لگانے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ مجمع کی قوت سے خود بخود اسی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے، لیکن اگر اس کے مخالف سمت میں اگر کوئی چلنا چاہے تو وہ بہت زور مار کر بھی مشکل ہی ایک آدھ قدم چل سکتا ہے اور جتنے قدم وہ چلتا ہے مجمع کا ایک ہی ریلا اس سے کئی گنے زیادہ قدم اسے پیچھے دھکیل دیتا ہے، اسی طرح اجتماعی نظام بھی جب غیر صالح لوگوں کی قیادت میں کفر و فسق کی راہ پر چل پڑتا ہے تو افراد اور گروہوں کے لیے غلط راہ پر چلنا تو اتنا آسان ہو جاتا ہے کہ انہیں بطور خود اس پر چلنے کے لیے کچھ زور لگانے کی بھی ضرورت نہیں پڑتی، لیکن اگر وہ اس کے خلاف چلنا چاہیں تو اپنے جسم و جان کا سارا زور لگانے پر بھی ایک آدھ قدم ہی راہِ راست پر بڑھ سکتے ہیں اور اجتماعی رو ان کی مزاحمت کے باوجود انہیں دھکیل کر میلوں پیچھے ہٹا لے جاتی ہے۔

یہ بات جو میں عرض کر رہا ہوں، یہ اب کوئی ایسی نظری حقیقت نہیں رہی ہے جسے ثابت کرنے کے لیے دلائل کی ضرورت ہو،

بلکہ واقعات نے اسے ایک بدیہی حقیقت بنا دیا ہے جس سے کوئی صاحب دیدۂ بینا انکار نہیں کرسکتا۔ آپ خود ہی دیکھ لیں کہ پچھلے سو برس کے اندر آپ کے اپنے ملک میں کس طرح خیالات و نظریات بدلے ہیں، مذاق اور مزاج بدلے ہیں، سوچنے کے انداز اور دیکھنے کے زاویے بدلے ہیں، تہذیب و اخلاق کے معیار اور قدر و قیمت کے پیمانے بدلے ہیں، زندگی کے طریقے اور معاملات کے ڈھنگ بدلے ہیں، اور کونسی چیز رہ گئی ہے جو بدل نہ گئی ہو۔ یہ سارا تغیر جو دیکھتے دیکھتے آپ کی اسی سرزمین میں ہوا اس کی اصلی وجہ آخر کیا ہے؟ کیا آپ اس کی وجہ اس کے سوا کچھ اور بتلا سکتے ہیں کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں زمام کار تھی، اور رہنمائی و فرمانروائی کی باگوں پر جن کا قبضہ تھا انھوں نے پورے ملک کے اخلاق، اذہان، نفسیات، معاملات اور نظام تمدن کو اس سانچے میں ڈھال کر رکھ دیا جو ان کی اپنی پسند کے مطابق تھا؟ پھر جن طاقتوں نے اس تغیر کی مزاحمت کی، ذرا حساب کر دیکھیے کہ انھیں کتنی کامیابی نصیب ہوئی اور وہ کہاں تک کامیاب ہوسکیں۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ کل جو مزاحمت کی تحریک کے پیشوا تھے آج ان کی اولاد وقت کی رو میں بہی چلی جا رہی ہے اور ان کے گھروں تک میں وہی سب کچھ پہنچ گیا ہے جو گھروں سے باہر پھیل چکا تھا؟ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ مقدس ترین مذہبی پیشواؤں تک کی نسل سے وہ لوگ اٹھ رہے ہیں جنھیں خدا کے وجود اور وحی و رسالت کے امکان میں بھی شک ہے؟ اس مشاہدے اور تجربے کے بعد بھی کیا کسی کو اس حقیقت کے تسلیم کرنے میں تامل ہوسکتا ہے کہ انسانی زندگی کے مسائل میں اصل فیصلہ کن مسئلہ زمام کار کا مسئلہ ہے؟ اور یہ اہمیت اس مسئلے نے کچھ آج ہی اختیار نہیں کی ہے بلکہ ہمیشہ سے اس کی یہی اہمیت رہی ہے۔ الناس علیٰ دین ملوکھم بہت پرانا مقولہ ہے اور اسی بنا پر حدیث میں قوموں کے بناؤ اور بگاڑ کا ذمہ دار ان کے علماء اور امراء کو قرار دیا گیا ہے کیونکہ لیڈرشپ اور زمام کار انھی کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔

اس تشریح کے بعد یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ دین میں اس مسئلہ کی کیا اہمیت ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اللہ کا دین اول تو یہ چاہتا ہے کہ لوگ بالکلیہ بندۂ حق بن کر رہیں اور ان کی گردن میں اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی کا حلقہ نہ ہو۔ پھر وہ یہ چاہتا ہے کہ اللہ ہی کا قانون لوگوں کی زندگی کا قانون بن کر رہے۔ پھر اس کا مطالبہ یہ ہے کہ زمین سے فساد مٹایا جائے، ان منکرات کا استیصال کیا جائے جو اہل زمین پر اللہ کے غضب کے موجب ہوتے ہیں، اور ان خیرات و حسنات کو فروغ دیا جائے جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں۔ ان تمام مقاصد میں کوئی مقصد بھی اس طرح پورا نہیں ہوسکتا کہ نوع انسانی کی رہنمائی و قیادت اور معاملات انسانی کی سربراہ کاری ائمۂ کفر و ضلال کے ہاتھوں میں ہو اور دین حق کے پیرو محض ان کے ماتحت رہ کر ان کی دی ہوئی رعایتوں اور گنجائشوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یاد خدا کرتے رہیں۔ یہ مقاصد تو لازمی طور پر اس بات کا مطالبہ کرتے ہیں کہ تمام اہل خیر و صلاح جو اللہ کی رضا کے طالب ہوں، اجتماعی قوت پیدا کریں اور سردھڑ کی بازی لگا کر ایک ایسا نظام حق قائم کرنے کی سعی کریں جس میں امامت و رہنمائی اور قیادت و فرمانروائی کا منصب مومنین صالحین کے ہاتھوں میں ہو۔ اس چیز کے بغیر وہ مدعا حاصل ہی نہیں ہوسکتا جو دین کا اصل مدعا ہے۔ اسی لیے دین میں امامت صالحہ کے قیام اور نظام حق کی اقامت کو مقصدی اہمیت حاصل ہے اور اس چیز سے غفلت برتنے کے بعد کوئی عمل ایسا نہیں ہوسکتا جس سے انسان اللہ تعالیٰ کی رضا کو پہنچ سکے۔ غور کیجیے کہ آخر قرآن و حدیث میں التزام جماعت اور سمع و طاعت پر اتنا زور کیوں دیا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص جماعت سے خروج اختیار کرے تو وہ واجب القتل ہے خواہ وہ کلمۂ توحید کا قائل اور نماز روزہ کا پابند ہی کیوں نہ ہو۔ کیا

اس کی وجہ یہ اور صرف یہی نہیں ہے کہ امامت صالحہ اور نظام حق کا قیام و بقا دین کا حقیقی مقصود ہے، اور اس مقصد کا حصول اجتماعی طاقت پر موقوف ہے جو شخص اجتماعی طاقت کو نقصان پہنچاتا ہے وہ اتنے بڑے جرم کا ارتکاب کرتا ہے جس کی تلافی نہ نماز سے ہو سکتی ہے اور نہ اقرار توحید سے، پھر دیکھیے کہ آخر اس دین میں جہاد کو اتنی اہمیت کیوں دی گئی ہے کہ اس سے جی چرانے اور منہ موڑنے والوں پر قرآن مجید نفاق کا حکم لگاتا ہے؟ جہاد، نظام حق کی سعی کا ہی تو دوسرا نام ہے۔ اور قرآن اسی جہاد کو وہ کسوٹی قرار دیتا ہے جس پر آدمی کا ایمان پرکھا جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر جس کے دل میں ایمان ہوگا وہ نہ تو نظام باطل کے تسلط پر راضی ہو سکتا ہے اور نہ نظام حق کے قیام کی جدوجہد میں جان و مال سے دریغ کر سکتا ہے۔ اور اگر کوئی اس معاملہ میں کمزوری دکھاتا ہے تو اس کا ایمان ہی مشتبہ ہے پھر بھلا کوئی دوسرا عمل اسے کیا نفع پہنچا سکتا ہے۔

اس وقت اتنا موقع نہیں ہے کہ میں آپ کے سامنے اس مسئلہ کی پوری تفصیل بیان کروں، مگر جو کچھ میں نے عرض کیا ہے وہ اس حقیقت کو ذہن نشین کرنے کے لیے بالکل کافی ہے کہ اسلام کے نقطۂ نظر سے امامت صالحہ کا قیام مرکزی اور مقصدی اہمیت رکھتا ہے، اور جو شخص اس دین پر ایمان لایا ہو اس کا کام صرف اتنے ہی پر ختم نہیں ہو جاتا کہ اپنی زندگی کو حتی الامکان اسلام کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرے، بلکہ عین اس کے ایمان ہی کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنی تمام سعی وجہد کو اس ایک مقصد پر مرکوز کر دے کہ زمام کار کفار و فساق کے ہاتھ سے نکل کر صالحین کے ہاتھ میں آئے اور وہ نظام حق قائم ہو جائے جو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق دنیا کے انتظام کو درست رکھے۔ پھر چونکہ یہ مقصد اعلیٰ اجتماعی کوشش کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا اس لیے ایک ایسی جماعت صالحہ کا وجود ضروری ہے جو خود اصول حق کی پابند ہو اور نظام حق کو قائم کرنے، باقی رکھنے اور ٹھیک ٹھیک چلانے کے سوا دنیا میں کوئی دوسری غرض پیش نظر نہ رکھے۔ روئے زمین پر اگر صرف ایک ہی آدمی مومن ہو تب بھی اس کے لیے یہ درست نہیں ہے کہ اپنے آپ کو اکیلا پا کر اور ذرائع مفقود دیکھ کر نظام باطل کے تسلط پر راضی ہو جائے، یا "اھون البلیتین" کے شرعی حیلے تلاش کر کے غلبۂ کفر و فسق کے ماتحت کچھ آدھی پونی مذہبی زندگی کا سودا چکانا شروع کر دے، بلکہ اس کے لیے سیدھا اور صاف راستہ صرف یہی ایک ہے کہ بندگان خدا کو اس طریق زندگی کی طرف بلائے جو خدا کو پسند ہے۔ پھر اگر کوئی اس کی بات سن کر نہ دے تو اس کا ساری عمر صراط مستقیم پر کھڑے ہو کر لوگوں کو پکارتے رہنا اور پکارتے پکارتے مر جانا اس سے لاکھ درجہ بہتر ہے کہ وہ اپنی زبان سے وہ صدائیں بلند کرنے لگے جو ضلالت میں بھٹکی ہوئی دنیا کو مرغوب ہوں اور ان راہوں پر چل پڑے جن پر کفار کی امامت میں دنیا چل رہی ہو۔ اور اگر کچھ اللہ کے بندے اس کی بات سننے پر آمادہ ہو جائیں تو اس کے لیے لازم ہے کہ ان کے ساتھ مل کر ایک جتھا بنائے اور یہ جتھا اپنی تمام اجتماعی قوت اس مقصد عظیم کے لیے جدوجہد کرنے میں صرف کر دے جس کا میں ذکر کر رہا ہوں۔

حضرات! مجھے خدا نے دین کا جو تھوڑا بہت علم دیا ہے اور قرآن و حدیث کے مطالعہ سے جو کچھ بصیرت مجھے حاصل ہوئی ہے اس سے میں دین کا تقاضا یہی کچھ سمجھا ہوں۔ یہی میرے نزدیک کتاب الٰہی کا مطالبہ ہے، یہی انبیاء کی سنت ہے۔ اور میں اپنی اس رائے سے نہیں ہٹ سکتا جب تک کوئی خدا کی کتاب اور رسول کی سنت ہی سے مجھ پر یہ ثابت نہ کر دے کہ دین کا یہ تقاضا نہیں ہے۔

اپنی سعی کے اس مقصد و منتہا کو سمجھ لینے کے بعد اب ہمیں اس سنت اللہ کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے جس کے تحت ہم اپنے اس مقصود کو پا سکتے ہیں۔ یہ کائنات جس میں ہم رہتے ہیں، اس کو اللہ تعالیٰ نے ایک قانون پر بنایا ہے اور اس کی ہر چیز ایک لگے بندھے ضابطے پر چل رہی ہے۔ یہاں کوئی سعی محض پاکیزہ خواہشات اور اچھی نیتوں کی بنا پر کامیاب نہیں ہو سکتی اور نہ محض نفوس قدسیہ کی برکتیں ہی اس کو بارآور کر سکتی ہیں، بلکہ اس کے لیے ان شرائط کا پورا ہونا ضروری ہے جو کسی سعی کو بارآور کرنے کے لیے قانون الٰہی میں مقرر ہیں۔ آپ اگر زراعت کریں تو خواہ آپ کتنے ہی بزرگ صفت انسان ہوں اور تسبیح و تہلیل میں کتنا ہی مبالغہ کرتے ہوں، لیکن آپ کا پھینکا ہوا کوئی بیج بھی برگ و بار نہیں لا سکتا جب تک آپ اپنی سعی کاشتکاری میں اس قانون کی پوری پوری پابندی ملحوظ نہ رکھیں جو اللہ تعالیٰ نے کھیتوں کی بارآوری کے لیے مقرر کر دیا ہے۔ اسی طرح نظام امامت کا وہ انقلاب بھی جو اس وقت آپ کے پیش نظر ہے، کبھی محض دعاؤں اور پاک تمناؤں سے رونما نہ ہو سکے گا بلکہ اس کے لیے بھی ناگزیر ہے کہ آپ اس قانون کو سمجھیں اور اس کی ساری شرطیں پوری کریں جس کے تحت دنیا میں امامت قائم ہوتی ہے، کسی کو ملتی ہے اور کسی سے چھنتی ہے۔ اگرچہ اس سے پہلے بھی میں اس مضمون کو اپنی تحریروں اور تقریروں میں اشارۃً بیان کرتا رہا ہوں، لیکن آج میں اسے زیادہ تفصیل و تشریح کے ساتھ پیش کرنا چاہتا ہوں کیونکہ یہ وہ مضمون ہے جسے پوری طرح سمجھے بغیر ہمارے سامنے اپنی راہ عمل واضح نہیں ہو سکتی۔

انسان کی ہستی کا اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اندر دو مختلف حیثیتیں پائی جاتی ہیں جو ایک دوسرے سے مختلف بھی ہیں اور باہم دگر ملی جلی بھی۔ اس کی ایک حیثیت تو یہ ہے کہ وہ اپنا ایک طبعی و حیوانی وجود رکھتا ہے جس پر وہی قوانین جاری ہوتے ہیں جو تمام طبعیات و حیوانات پر فرمانروائی کر رہے ہیں۔ اس وجود کی کارکردگی منحصر ہے ان آلات و وسائل پر، ان مادی ذرائع پر، اور ان طبعی حالات پر جن پر دوسری تمام طبعی اور حیوانی موجودات کی کارکردگی کا انحصار ہے۔ یہ وجود جو کچھ کر سکتا ہے قوانین طبعی کے تحت، آلات و وسائل کے ذریعہ سے اور طبعی حالات کے اندر ہی رہتے ہوئے کر سکتا ہے۔ اور اس کے کام پر عالم اسباب کی تمام قوتیں مخالف یا موافق اثر ڈالتی ہیں۔ دوسری حیثیت جو انسان کے اندر نمایاں نظر آتی ہے وہ اس کے انسان ہونے کی، یا بالفاظ دیگر ایک اخلاقی وجود ہونے کی حیثیت ہے۔

یہ اخلاقی وجود طبعیات کا تابع نہیں ہے بلکہ ان پر ایک طرح سے حکومت کرتا ہے۔ یہ خود انسان کے طبعی و حیوانی وجود کو بھی آلہ کے طور پر استعمال کرتا ہے اور خارجی دنیا کے اسباب کو بھی اپنا تابع بنانے اور ان سے کام لینے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی کارکن قوتیں وہ اخلاقی اوصاف ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انسان میں ودیعت فرمائے ہیں، اور اس پر فرمانروائی بھی طبعی قوانین کی نہیں بلکہ اخلاقی قوانین کی ہے۔

ل

یہ دونوں حیثیتیں انسان کے اندر ملی جلی کام کر رہی ہیں اور مجموعی طور پر اس کی کامیابی و ناکامی اور اس کے عروج و زوال کا مدار مادی اور اخلاقی دونوں قسم کی قوتوں پر ہے۔ وہ بے نیاز تو نہ مادی قوت سے ہو سکتا ہے اور نہ اخلاقی قوت سے۔ اسے عروج ہوتا ہے تو دونوں کے بل پر ہوتا ہے اور وہ گرتا ہے تو اسی وقت گرتا ہے جب یہ دونوں طاقتیں اس کے ہاتھ سے جاتی رہتی ہیں، یا ان میں وہ دوسروں کی بہ نسبت کمزور ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر غائر نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ انسانی

زندگی میں اصل فیصلہ کن اہمیت اخلاقی طاقت کی ہے نہ کہ مادی کی۔ اس میں شک نہیں کہ مادی وسائل کا حصول، طبعی ذرائع کا استعمال اور اسبابِ خارجی کی موافقت بھی کامیابی کے لیے شرط لازم ہے اور جب تک انسان اس عالمِ طبیعی (   ) میں رہتا ہے، یہ شرط کسی طرح ساقط نہیں ہو سکتی۔ مگر وہ اصل چیز جو انسان کو گراتی اور اٹھاتی ہے، جسے اس کی قسمت کے بنانے اور بگاڑنے میں سب سے بڑھ کر دخل حاصل ہے وہ اخلاقی طاقت ہی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہم جس چیز کی وجہ سے انسان کو انسان کہتے ہیں وہ اس کی جسمانیت یا حیوانیت نہیں بلکہ اس کی اخلاقیت ہے۔ آدمی دوسری موجودات سے جس خصوصیت کی بنا پر ممیز ہوتا ہے وہ یہ نہیں ہے کہ وہ جگہ گھیرتا ہے یا سانس لیتا ہے یا نسل کشی کرتا ہے، بلکہ اس کی وجہ امتیازی خصوصیت جو اسے ایک مستقل نوع ہی نہیں، خلیفۃ اللہ فی الارض بناتی ہے وہ اس کا اخلاقی اختیار ہے اور اخلاقی ذمہ داری کا حامل ہونا ہے۔ پس جب اصل جوہرِ انسانیت اخلاق ہے تو لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ اخلاقیات ہی کو انسانی زندگی کے بناؤ اور بگاڑ میں فیصلہ کن مقام حاصل ہے اور اخلاقی قوانین ہی انسان کے عروج و زوال پر فرمانروا ہیں۔

اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد جب ہم اخلاقیات کا تجزیہ کرتے ہیں تو وہ اصولی طور پر ہمیں دو بڑے شعبوں میں منقسم نظر آتے ہیں: ایک، بنیادی انسانی اخلاقیات۔ دوسرے، اسلامی اخلاقیات۔

بنیادی انسانی اخلاقیات سے مراد وہ اوصاف ہیں جن پر انسان کے اخلاقی وجود کی اساس قائم ہے اور ان میں وہ تمام صفات شامل ہیں جو دنیا میں انسان کی کامیابی کے لیے بہرحال شرط لازم ہیں خواہ وہ صحیح مقصد کے لیے کام کر رہا ہو یا غلط مقصد کے لیے۔ ان اخلاقیات میں اس سوال کا کوئی دخل نہیں ہے کہ آدمی خدا اور وحی اور رسول اور آخرت کو مانتا ہے یا نہیں، طہارتِ نفس اور نیتِ خیر اور عملِ صالح سے آراستہ ہے یا نہیں، اچھے مقصد کے لیے کام کر رہا ہے یا برے مقصد کے لیے۔ قطع نظر اس سے کہ کسی میں ایمان ہو یا نہ ہو اور اس کی زندگی پاک ہو یا ناپاک، اور اس کی سعی کا مقصد اچھا ہو یا برا، جو شخص اور جو گروہ بھی اپنے اندر وہ اوصاف رکھتا ہوگا جو دنیا میں کامیابی کے لیے ناگزیر ہیں وہ یقیناً کامیاب ہوگا اور ان لوگوں سے بازی لے جائے گا جو ان اوصاف کے لحاظ سے اس کے مقابلہ میں ناقص ہوں گے۔ مومن ہو یا کافر، نیک ہو یا بد، مصلح ہو یا مفسد غرض جو بھی ہو، وہ اگر کارگر انسان ہو سکتا ہے تو صرف اسی صورت میں جبکہ اس کے اندر ارادے کی طاقت اور فیصلے کی قوت ہو، عزم اور حوصلہ ہو، صبر و ثبات اور استقلال ہو، تحمل اور برداشت ہو، ہمت اور شجاعت ہو، مستعدی و جفاکشی ہو، اپنے مقصد کا عشق اور اس کے لیے ہر چیز قربان کر دینے کا بل بوتا ہو، حزم و احتیاط اور معاملہ فہمی و تدبر ہو، باضابطگی کے ساتھ کام کرنے کا سلیقہ ہو، فرض شناسی اور احساسِ ذمہ داری ہو، حالات کو سمجھنے اور ان کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنے اور مناسب تدبیر کرنے کی قابلیت ہو، اپنے جذبات و خواہشات اور ہیجانات پر قابو ہو، اور دوسرے انسانوں کو موہنے، ان کے دل میں جگہ پیدا کرنے اور ان سے کام لینے کی صلاحیت ہو۔ پھر ناگزیر ہے کہ اس کے اندر وہ شریفانہ خصائل بھی کچھ نہ کچھ موجود ہوں جو فی الحقیقت جوہرِ آدمیت ہیں اور جن کی بدولت آدمی کا وقار و اعتبار دنیا میں قائم ہوتا ہے۔ مثلاً خودداری، فیاضی، رحم، ہمدردی، انصاف، وسعتِ قلب و نظر، سچائی، امانت، راستبازی، پاسِ عہد، معقولیت، اعتدال، شائستگی، طہارت و نظافت، اور ذہن و نفس کا انضباط۔ یہ اوصاف اگر کسی قوم یا گروہ کے بیشتر افراد میں موجود ہوں تو گویا یوں سمجھیے کہ اس کے پاس وہ سرمایۂ انسانیت

موجود ہے جس سے ایک طاقتور اجتماعیت وجود میں آسکتی ہے۔ لیکن یہ سرمایہ مجتمع ہو کر بالفعل ایک مضبوط و مستحکم اور کارگر اجتماعی طاقت نہیں بن سکتا جب تک کہ کچھ دوسرے اخلاقی اوصاف بھی اس کی مدد پر نہ آئیں، مثلاً تمام یا بیشتر افراد کسی اجتماعی نصب العین پر متفق ہوں اور اس نصب العین کو اپنی انفرادی اغراض بلکہ اپنی جان مال اور اولاد سے بھی عزیز تر رکھیں، ان کے اندر آپس کی محبت اور ہمدردی ہو، انھیں مل کر کام کرنا آتا ہو، وہ اپنی خودی و نفسانیت کو کم از کم اس حد تک قربان کر سکیں جو منظم سعی کے لیے ناگزیر ہے، وہ صحیح و غلط رہنما میں تمیز کر سکتے ہوں اور موزوں آدمیوں ہی کو اپنا رہنما بنائیں، ان کے رہنماؤں میں اخلاص اور حسن تدبیر اور رہنمائی کی دوسری ضروری صفات موجود ہوں، اور خود قوم یا جماعت اپنے رہنماؤں کی اطاعت کرنا جانتی ہو، ان پر اعتماد رکھتی ہو اور اپنے تمام ذہنی، جسمانی اور مادی ذرائع ان کے تصرف میں دے دینے پر تیار رہو۔ نیز پوری قوم کے اندر ایسی زندہ اور حساس رائے عام پائی جاتی ہو جو کسی ایسی چیز کو اپنے اندر پنپنے نہ دے جو اجتماعی فلاح کے لیے نقصان دہ ہو۔

یہ ہیں وہ اخلاقیات جن کو میں "بنیادی انسانی اخلاقیات" کے لفظ سے تعبیر کرتا ہوں، کیونکہ فی الواقع یہی اخلاقی اوصاف انسان کی اخلاقی طاقت کا اصل منبع ہیں، اور انسان کسی مقصد کے لیے بھی دنیا میں کامیاب سعی نہیں کر سکتا جب تک کہ ان اوصاف کا زور اس کے اندر موجود نہ ہو۔ ان اخلاقیات کی مثال ایسی ہے جیسے فولاد کہ وہ اپنی ذات میں مضبوطی و استحکام رکھتا ہے، اور اگر کوئی کارگر ہتھیار بن سکتا ہے تو اسی سے بن سکتا ہے، قطع نظر اس سے کہ وہ غلط مقصد کے لیے استعمال ہو یا صحیح مقصد کے لیے۔ آپ کے پیش نظر صحیح مقصد ہو تب بھی تو آپ کے لیے مفید وہی ہتھیار ہو سکتا ہے جو فولاد سے بنا ہو، نہ کہ سڑی ہوئی پھس پھسی لکڑی سے جو ایک ذرا سے بوجھ اور معمولی سی چوٹ کی تاب بھی نہ لا سکتی ہو۔ یہی وہ بات ہے جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں بیان فرمایا ہے کہ خیارکم فی الجاھلیۃ خیارکم فی الاسلام، "تم میں جو لوگ جاہلیت میں اچھے تھے وہی اسلام میں بھی اچھے ہیں" یعنی زمانۂ جاہلیت میں جو لوگ اپنے اندر جوہر قابل رکھتے تھے وہی زمانۂ اسلام میں مردانِ کار ثابت ہوئے، فرق صرف یہ ہے کہ ان کی قابلیتیں پہلے غلط راہوں میں صرف ہو رہی تھیں اور اسلام نے آکر انھیں صحیح راہ پر لگا دیا۔ مگر بہرحال ناکارہ انسان نہ جاہلیت کے کسی کام کے تھے نہ اسلام کے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو عرب میں جو زبردست کامیابی حاصل ہوئی اور جس کے اثرات تھوڑی ہی مدت گزرنے کے بعد دریائے سندھ سے لے کر اٹلانٹک کے ساحل تک دنیا کے ایک بڑے حصے نے محسوس کر لیے، اس کی وجہ یہی تو تھی کہ آپ کو عرب میں بہترین انسانی مواد مل گیا تھا جس کے اندر کیریکٹر کی زبردست طاقت موجود تھی۔ اگر خدانخواستہ آپ کو بودے، کم ہمت، ضعیف الارادہ اور ناقابل اعتماد لوگوں کی بھیڑ مل جاتی تو کیا پھر بھی وہ نتائج نکل سکتے تھے؟

اب اخلاقیات کے دوسرے شعبے کو لیجیے جسے میں "اسلامی اخلاقیات" کے لفظ سے تعبیر کر رہا ہوں۔ یہ بنیادی انسانی اخلاقیات سے الگ کوئی چیز نہیں ہے بلکہ اسی کی تصحیح اور تکمیل ہے۔

اسلام کا پہلا کام یہ ہے کہ وہ بنیادی انسانی اخلاقیات کو ایک صحیح مرکز و محور مہیا کر دیتا ہے جس سے وابستہ ہو کر وہ سراپا خیر بن جاتے ہیں۔ اپنی ابتدائی صورت میں یہ اخلاقیات مجرد ایک قوت ہیں، جو خیر بھی ہو سکتی ہے اور شر بھی۔ جس طرح تلوار کا حال ہے کہ وہ بس ایک کاٹ ہے جو ڈاکو کے ہاتھ میں جا کر آلۂ ظلم بھی بن سکتی ہے اور مجاہد فی سبیل اللہ کے ہاتھ میں جا کر وسیلۂ خیر بھی۔ اسی طرح ان اخلاقیات کی طاقت بھی کسی شخص یا گروہ میں ہونا بجائے خود خیر نہیں ہے بلکہ اس کا

خیر ہونا موقوف ہے اس امر پر کہ یہ قوت صحیح راہ میں صرف ہو۔ یہ اس کو صحیح راہ پر لگانے کی خدمت اسلام انجام دیتا ہے۔ اسلام کی دعوتِ توحید کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ دنیا کی زندگی میں انسان کی تمام کوششوں اور محنتوں اور دوڑ دھوپ کا مقصد وحید اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول ہو۔ ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی۔ اور اس کا پورا دائرہ فکر و عمل ان حدود سے محدود ہو جائے جو اللہ نے اس کے لیے مقرر کر دی ہیں۔ ایاک نعبد ولک نصلی ونسجد۔ اس اساسی اصلاح کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ تمام بنیادی اخلاقیات جن کا ابھی میں نے آپ سے ذکر کیا ہے، صحیح راہ پر لگ جاتے ہیں اور وہ قوت جو ان اخلاقیات کی موجودگی سے پیدا ہوتی ہے بجائے اس کے کہ نفس یا خاندان یا قوم یا ملک کی سربلندی پر ہر ممکن طریقے سے صرف ہو، خالص حق کی سربلندی پر صرف جائز طریقوں سے صرف ہونے لگتی ہے۔ یہی چیز اس کو ایک مجرد قوت کے مرتبے سے اٹھا کر ایجاباً ایک بھلائی اور دنیا کے لیے ایک رحمت بنا دیتی ہے۔

دوسرا کام جو اخلاق کے باب میں اسلام کرتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ بنیادی انسانی اخلاقیات کو مستحکم بھی کرتا ہے اور پھر ان کے اطلاق کو انتہائی حدود تک وسیع بھی کر دیتا ہے۔ مثال کے طور پر صبر کو لیجیے۔ بڑے سے بڑے صابر آدمی میں بھی جو محض دنیوی اغراض کے لیے ہو اور جسے شرک یا مادہ پرستی کی فکری جڑوں سے غذا مل رہی ہو، اس کے برداشت اور اس کے ثبات و قرار کی ایک حد ہوتی ہے جس کے بعد وہ گھبرا اٹھتا ہے۔ لیکن جس صبر کو توحید کی جڑ سے غذا ملے اور جو دنیا کے لیے نہیں بلکہ اللہ رب العالمین کے لیے ہو، وہ تحمل و برداشت اور پامردی کا ایک اتھاہ خزانہ ہوتا ہے جسے دنیا کی تمام ممکن مشکلات مل کر بھی لوٹ نہیں سکتیں۔ پھر غیر مسلم کا صبر نہایت محدود نوعیت کا ہوتا ہے۔ اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ ابھی توپوں اور گولیوں کی بوچھاڑ میں نہایت استقلال کے ساتھ ڈٹا ہوا تھا، اور ابھی جو جذبات شہوانی کی تسکین کا کوئی موقع سامنے آیا تو وہ نفس امارہ کی ایک معمولی تحریک کے مقابلہ میں بھی نہ ٹھہر سکا۔ لیکن اسلام صبر کو انسان کی پوری زندگی میں پھیلا دیتا ہے اور اسے صرف خطرات، مصائب اور مشکلات ہی کے مقابلہ میں نہیں بلکہ تمام ایسے لالچوں، خطروں، اندیشوں اور خواہشوں کے مقابلہ میں بھی ٹھیراؤ کی ایک ایسی زبردست طاقت بنا دیتا ہے جو آدمی کو راہ راست سے ہٹانے والے ہوں۔ درحقیقت اسلام مومن کی پوری زندگی کو ایک صابرانہ زندگی بناتا ہے جس کا بنیادی اصول ہی یہ ہے کہ عمر بھر صحیح طرز خیال اور صحیح طرز عمل پر قائم رہو خواہ اس میں کتنے ہی خطرات و نقصانات اور مشکلات ہوں اور اس دنیا کی زندگی میں اس کا کوئی مفید نتیجہ نکلتا نظر نہ آتا ہو، اور کبھی فکر و عمل کی برائی نہ اختیار کرو خواہ فائدوں اور امیدوں کا کیسا ہی خوشنما سبز باغ تمہارے سامنے لہلہا رہا ہو۔ یہ آخرت کے قطعی نتائج کی توقع پر دنیا کی ساری زندگی میں بدی سے رکنا اور خیر کی راہ پر جم کر چلنا اسلامی صبر ہے اور اس کا ظہور انہی شکلوں میں بھی ہوتا ہے جو بہت محدود پیمانے پر کفار کی زندگی میں نظر آتی ہیں۔ اسی خیال پر دوسرے تمام بنیادی اخلاقیات کو بھی آپ قیاس کر سکتے ہیں جو کفار کی زندگی میں، صحیح فکری بنیاد نہ ہونے کی وجہ سے ضعیف اور محدود ہوتے ہیں اور اسلام ان سب کو ایک صحیح بنیاد دے کر مستحکم بھی کرتا ہے اور وسیع بھی کر دیتا ہے۔

اسلام کا تیسرا کام یہ ہے کہ وہ بنیادی اخلاقیات کی ابتدائی منزل پر اخلاق فاضلہ کی ایک نہایت شاندار بالاتر منزل تعمیر کرتا ہے جس کی بدولت انسان اپنے شرف کی انتہائی بلندی پر پہنچ جاتا ہے۔ وہ اس کے نفس کو خود غرضی سے، نفسانیت

ہے، ظلم سے، بے حیائی اور خلاعت و بے قیدی سے پاک کر دیتا ہے۔ اس میں خدا ترسی، تقویٰ و پرہیزگاری، اور حق پرستی پیدا کرتا ہے۔ اس کے اندر اخلاقی ذمہ داریوں کا شعور و احساس ابھارتا ہے، اس کو ضبط نفس کا خوگر بناتا ہے، اسے تمام مخلوقات کے لیے کریم، فیاض، رحیم، ہمدرد، امین، بے غرض خیر خواہ، بے لوث منصف، اور ہر حال میں صادق و راستباز بنا دیتا ہے، اور اس میں ایک ایسی بلند پایہ سیرت پرورش کرتا ہے جس سے ہمیشہ صرف بھلائی ہی متوقع ہو اور برائی کا کوئی اندیشہ نہ ہو۔ پھر اسلام آدمی کو محض نیک ہی بنانے پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ حدیث رسول کے الفاظ میں وہ اسے مفتاحٌ للخیر مغلاق للشر، یعنی بھلائی کا دروازہ کھولنے والا اور برائی کا دروازہ بند کرنے والا بناتا ہے۔ یعنی وہ ایجابًا یہ مشن اس کے سپرد کرتا ہے کہ دنیا میں بھلائی پھیلائے اور برائی کو روکے۔ اس سیرت و اخلاق میں فطرۃً وہ حسن ہے۔ وہ کشش ہے۔ وہ بلا کی قوت تسخیر ہے کہ اگر کوئی منظم جماعت اس سیرت کی حامل ہو اور عملاً اپنے اس مشن کے لیے سعی کرے، جو اسلام نے اس کے سپرد کیا ہے، تو اس کی جہانگیری کا مقابلہ کرنا دنیا کی کسی قوت کے بس کا کام نہیں ہے۔

اب میں چند الفاظ میں اس سنت اللہ کو بیان کیے دیتا ہوں جو امامت کے باب میں ابتدائے آفرینش سے جاری ہے اور جب تک نوع انسانی اپنی موجودہ فطرت پر زندہ ہے اس وقت تک برابر جاری رہے گی۔ اور وہ یہ ہے کہ:

(۱) اگر دنیا میں کوئی منظم انسانی گروہ ایسا موجود نہ ہو جو اسلامی اخلاقیات اور بنیادی انسانی اخلاقیات دونوں سے آراستہ ہو اور پھر مادی اسباب و وسائل بھی استعمال کرے تو دنیا کی امامت و قیادت لازمًا کسی ایسے گروہ کے قبضے میں دی جاتی ہے جو بنیادی انسانی اخلاقیات اور مادی اسباب و وسائل کے اعتبار سے دوسروں کی بہ نسبت زیادہ بڑھا ہوا ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ بہرحال اپنی دنیا کا انتظام چاہتا ہے اور یہ انتظام اسی گروہ کے سپرد کیا جاتا ہے جو موجود الوقت گروہوں میں اہل تر ہو۔

(۲) لیکن اگر کوئی منظم گروہ ایسا موجود ہو جو اسلامی و انسانی اخلاقیات اور بنیادی اخلاقیات دونوں میں باقی ماندہ انسانی دنیا پر فضیلت رکھتا ہو، اور وہ مادی اسباب و وسائل کے استعمال میں بھی کوتاہی نہ کرے، تو یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ اس کے مقابلہ میں کوئی دوسرا گروہ دنیا کی امامت و قیادت پر قابض رہ سکے۔ ایسا ہونا فطرت کے خلاف ہے۔ اللہ کی اس سنت کے خلاف ہے جو انسانوں کے معاملہ میں اس نے مقرر کر رکھی ہے۔ ان وعدوں کے خلاف ہے جو اللہ نے اپنی کتاب میں مومنین صالحین سے کیے ہیں۔ اور اللہ ہرگز فساد پسند نہیں ہے کہ اس کی دنیا میں ایک صالح گروہ انتظام عالم کو ٹھیک ٹھیک اس کی رضا کے مطابق درست رکھنے والا موجود ہو اور پھر بھی وہ مفسدوں ہی کے ہاتھ میں اس نظام کی باگ ڈور رہنے دے۔ مگر یہ خیال رہے کہ اس نتیجے کا ظہور صرف اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ ایک جماعت صالحہ ان اوصاف کی موجود ہو۔ کسی ایک صالح فرد، یا متفرق طور پر بہت سے صالح افراد موجود ہونے سے استخلاف فی الارض کا نظام تبدیل نہیں ہو سکتا، خواہ وہ افراد اپنی جگہ کیسے ہی زبردست اولیا، اللہ بلکہ پیغمبر ہی کیوں نہ ہو۔ اللہ نے استخلاف کے متعلق جتنے وعدے بھی کیے ہیں، منتشر و متفرق افراد سے نہیں بلکہ ایک ایسی جماعت سے کیے ہیں جو دنیا میں اپنے آپ کو عملاً خیر امۃ اور امۃ وسطا ثابت کر دے۔ نیز یہ بھی ذہن نشین رہے کہ ایسے ایک گروہ کے محض وجود میں آجانے ہی سے نظام امامت میں تغیر واقع نہ ہو جائے گا کہ ادھر وہ بنے اور ادھر اچانک آسمان سے کچھ فرشتے اتریں اور فساق و فجار

کو اقتدار کی گدی سے ہٹا کر انھیں مسند نشین کر دیں، بلکہ اس جماعت کو کفر و فسق کی طاقتوں سے زندگی کے ہر میدان میں ہر ہر قدم پر کشمکش اور مجاہدہ کرنا ہوگا اور اقامت حق کی راہ میں ہر قسم کی قربانیاں دے کر اپنی محبت حق اور اپنی اہلیت کا ثبوت دینا پڑے گا۔ یہ ایسی شرط ہے جس سے انبیاء تک مستثنیٰ نہ رکھے گئے کجا کہ آج کوئی اس سے مستثنیٰ ہونے کی توقع کرے۔

(۳) مادی طاقت اور اخلاقی طاقت کے تناسب کے باب میں قرآن اور تاریخ کے غائر مطالعہ سے جو سنت اللہ میں سمجھا ہوں وہ یہ ہے کہ جہاں اخلاقی طاقت کا سارا انحصار صرف بنیادی انسانی اخلاقیات پر ہو وہاں مادی وسائل بڑی اہمیت رکھتے ہیں، حتیٰ کہ اس امر کا بھی امکان ہے کہ اگر ایک گروہ کے پاس مادی وسائل کی طاقت بہت زیادہ ہو تو وہ تھوڑی اخلاقی طاقت سے بھی دنیا پر چھا جاتا ہے اور دوسرے گروہ اخلاقی طاقت میں فائق تر ہونے کے باوجود محض وسائل کی کمی کے باعث دبے رہتے ہیں لیکن جہاں اخلاقی طاقت میں اسلامی اور بنیادی، دونوں قسم کے اخلاقیات کا پورا زور شامل ہو وہاں مادی وسائل کے انتہائی کمی کے باوجود اخلاق کو آخر کار ان تمام طاقتوں پر غلبہ حاصل ہو کر رہتا ہے جو مجرد بنیادی اخلاقیات اور مادی سروسامان کے بل بوتے پر اٹھی ہوں۔ اس نسبت کو یوں سمجھیے کہ بنیادی اخلاقیات کے ساتھ اگر سو درجے مادی طاقت کی ضرورت ہوتی ہے تو اسلامی اور بنیادی اخلاقیات کی مجموعی قوت کے ساتھ صرف ۲۵ درجے مادی طاقت کافی ہو جاتی ہے۔ باقی ۷۵ فی صدی قوت کی کمی کو محض اسلامی اخلاق کا زور پورا کر دیتا ہے۔ بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد کا تجربہ تو یہ بتاتا ہے کہ اسلامی اخلاق اگر اس پیمانے کا ہو جو حضور اور آپ کے صحابہ کا تھا تو صرف پانچ فیصدی مادی طاقت سے بھی کام چل جاتا ہے۔ یہی حقیقت ہے جس کی طرف آیت اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ میں ارشاد کیا گیا ہے۔

یہ آخری بات جو میں نے عرض کی ہے اسے محض خوش عقیدگی پر محمول نہ کیجیے اور نہ یہ گمان کیجیے کہ میں کسی معجزہ و کرامت کا آپ سے ذکر کر رہا ہوں۔ نہیں، یہ بالکل ایک فطری حقیقت ہے۔ جو اس عالم اسباب میں قانون علت و معلول کے تحت پیش آتی ہے اور ہر وقت رونما ہو سکتی ہے اگر اس کی علت موجود ہو۔ میں مناسب سمجھتا ہوں کہ آگے بڑھنے سے پہلے چند الفاظ میں اس کی تشریح کر دوں کہ اسلامی اخلاقیات سے (جن میں بنیادی اخلاقیات خود بخود شامل ہیں) مادی اسباب کی ۷۵ فی صدی بلکہ ۹۵ فی صدی تک کمی کس طرح پوری ہو جاتی ہے۔ اس چیز کو سمجھنے کے لیے آپ ذرا خود اپنے زمانہ ہی کی بین الاقوامی صورت حال پر ایک نگاہ ڈال کر دیکھیے۔ ابھی آپ کے سامنے وہ فساد عظیم جو آج سے ساڑھے پانچ سال پہلے ہوا تھا جرمنی کی شکست پر ختم ہوا ہے اور جاپان کی شکست بھی قریب نظر آ رہی ہے جہاں تک بنیادی اخلاقیات کا تعلق ہے، ان کے اعتبار سے اس فساد کے دونوں فریق تقریباً مساوی ہیں، بلکہ بعض پہلوؤں سے جرمنی اور جاپان نے اپنے حریفوں کے مقابلہ میں زیادہ زبردست اخلاقی طاقت کا ثبوت دیا ہے۔ جہاں تک علوم طبیعی اور ان کے عملی استعمال کا تعلق ہے اس میں بھی دونوں فریق برابر ہیں، بلکہ اس معاملہ میں کم از کم جرمنی کی فوقیت تو کسی سے مخفی نہیں ہے۔ مگر صرف ایک چیز ہے جس میں ایک فریق دوسرے فریق سے بہت زیادہ بڑھا ہوا ہے، اور وہ ہے

مادی اسباب کی موافقت۔ اس کے پاس آدمی اپنے دونوں حریفوں سے کئی گنے زیادہ ہیں۔ اس کو مادی وسائل ان کی بہ نسبت بدرجہا زیادہ حاصل ہیں۔ اُس کی جغرافی پوزیشن ان سے بہتر ہے اور اس کو تاریخی اسباب نے ان کے مقابلہ میں بہت زیادہ بہتر حالات فراہم کر دیے ہیں۔ اسی وجہ سے اس کو فتح نصیب ہوئی ہے، اور اسی وجہ سے آج کسی ایسی قوم کے لیے بھی جس کی تعداد کم ہو اور جس کی دسترس میں مادی وسائل کم ہوں، اس امر کا امکان نظر نہیں آتا کہ وہ کثیر التعداد اور کثیر الوسائل قوموں کے مقابلہ میں سر اٹھا سکے، خواہ وہ بنیادی اخلاقیات میں اور طبعی علوم کے استعمال میں ان سے کچھ بڑھ ہی کیوں نہ جائے۔ اس لیے کہ بنیادی اخلاق اور طبعی علوم کے بل پر اٹھنے والی قوم کا معاملہ دو حال سے خالی نہیں ہو سکتا۔ یا تو وہ خود اپنی قومیت کی پرستار ہوگی اور دنیا کو اپنے لیے مسخر کرنا چاہے گی یا پھر وہ کچھ عالمگیر اصولوں کی حامی بن کر اٹھے گی اور دوسری قوموں کو ان کی طرف دعوت دے گی۔ پہلی صورت میں تو اس کے لیے کامیابی کی کوئی شکل بجز اس کے ہے ہی نہیں کہ وہ مادی طاقت اور وسائل میں دوسروں سے فائق تر ہو، کیونکہ وہ تمام قومیں جن پر اس کی اس حرصِ اقتدار کی زد پڑ رہی ہوگی، انتہائی غصہ و نفرت کے ساتھ اس کی مزاحمت کریں گی اور اس کا راستہ روکنے میں اپنی حد تک کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں گی۔ رہی دوسری صورت تو اس میں بلاشبہ اس کا امکان تو ضرور ہے کہ قوموں کے دل اور دماغ خود بخود اس کی اصولی دعوت سے مسخر ہوتے چلے جائیں اور راستے سے مزاحمتوں کو ہٹانے میں بہت تھوڑی قوت استعمال کرنی پڑے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ دل صرف چند خوش آیند اصولوں ہی سے مسخر نہیں ہو جایا کرتے بلکہ انھیں مسخر کرنے کے لیے وہ حقیقی خیر خواہی، نیک نیتی، راستبازی، بے غرضی، فراخ دلی، فیاضی، ہمدردی، اور شرافت و عدالت درکار ہے جو جنگ اور صلح، فتح اور شکست، دوستی اور دشمنی، تمام حالات کی کڑی آزمائشوں میں کھری اور بے لوث ثابت ہو، اور یہ چیز اخلاقیاتِ فاضلہ کی اس بلند منزل سے تعلق رکھتی ہے جس کا مقام بنیادی اخلاقیات سے بہت برتر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مجرد بنیادی اخلاقیات اور مادی طاقت کے بل پر اٹھنے والے خواہ کھلے قوم پرست ہوں یا پوشیدہ قوم پرستی کے ساتھ کچھ عالمگیر اصولوں کی دعوت و حمایت کا ڈھونگ رچائیں، آخر کار اُن کی ساری جدوجہد اور کشمکش خالص شخصی یا طبقاتی یا قومی خود غرضی ہی پر آ ٹھیرتی ہے، جیسا کہ آج آپ امریکہ، اور برطانیہ اور روس کی سیاست خارجیہ میں نمایاں طور پر دیکھ سکتے ہیں۔ ایسی کشمکش میں یہ ایک بالکل فطری امر ہے کہ ہر قوم دوسری قوم کے مقابلہ میں ایک مضبوط چٹان بن کر کھڑی ہو جائے اور اپنی پوری اخلاقی و مادی طاقت اس کی مزاحمت میں صرف کر دے اور اپنے حدود میں اس کو ہرگز راہ دینے کے لیے تیار نہ ہو جب تک کہ مخالف کی برتر مادی قوت اس کو پیس کر نہ رکھ دے۔

اچھا، اب ذرا تصور کیجیے کہ اسی ماحول میں ایک ایسا گروہ (خواہ وہ ابتداءً ایک ہی قوم میں سے اٹھا ہو، مگر "قوم" کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک "جماعت" کی حیثیت سے اٹھا ہو) پایا جاتا ہے، جو شخصی، طبقاتی اور قومی خود غرضیوں سے بالکل پاک ہے۔ اس کی سعی و جہد کی کوئی غرض اس کے سوا نہیں ہے کہ وہ نوعِ انسانی کی فلاح چند اصولوں کی پیروی میں دیکھتا ہے اور انسانی زندگی کا نظام ان پر قائم کرنا چاہتا ہے۔ ان اصولوں پر جو سوسائٹی وہ بناتا ہے اس میں قومی و وطنی اور طبقاتی و نسلی امتیازات بالکل مفقود ہیں۔ تمام انسان اس میں یکساں حقوق اور مساوی حیثیت سے شامل ہو سکتے ہیں،

اس میں رہنمائی و قیادت کا منصب ہر اس شخص یا مجموعۂ اشخاص کو حاصل ہو سکتا ہے جو ان اصولوں کی پیروی میں سب پر فوقیت لے جائے قطع نظر اس سے کہ اس کی نسلی و وطنی قومیت کچھ ہی ہو، حتیٰ کہ اس میں اس امر کا بھی امکان ہے کہ اگر مفتوح ایمان لاکر اپنے آپ کو صالح تر ثابت کر دے تو فاتح اپنی سرفروشیوں اور جانفشانیوں کے سارے ثمرات اس کے قدموں میں لاکر رکھ دے اور اس کو امام مان کر خود مقتدی بننا قبول کرلے۔ یہ گروہ جب اپنی دعوت لے کر اٹھتا ہے تو وہ لوگ جو اس کے اصولوں کو چلنے دینا نہیں چاہتے، اس کی مزاحمت کرتے ہیں اور اس طرح فریقین میں کشمکش شروع ہو جاتی ہے مگر اس کشمکش میں جتنی شدت بڑھتی جاتی ہے یہ گروہ اپنے مخالفوں کے مقابلہ میں اتنے ہی زیادہ افضل و اشرف اخلاق کا ثبوت دیتا چلا جاتا ہے۔ وہ اپنے طرزِ عمل سے ثابت کر دیتا ہے کہ واقعی وہ خلق اللہ کی بھلائی کے سوا کوئی دوسری غرض پیش نظر نہیں رکھتا۔ اس کی دشمنی اپنے مخالفوں کی ذات یا قومیت سے نہیں بلکہ صرف ان کی ضلالت و گمراہی سے ہے جسے وہ چھوڑ دیں تو وہ اپنے خون کے پیاسے دشمن کو بھی سینے سے لگا سکتا ہے۔ اسے لالچ ان کے مال و دولت یا ان کی تجارت و صنعت کا نہیں بلکہ خود انہی کی اخلاقی و روحانی فلاح کا ہے جو حاصل ہو جائے تو ان کی دولت انہی کو مبارک رہے۔ وہ سخت سے سخت آزمائش کے موقعوں پر جھوٹ، دغا اور مکر و فریب سے کام نہیں لیتا۔ ٹیڑھی چالوں کا جواب بھی سیدھی تدبیروں سے دیتا ہے۔ انتقام کے جوش میں بھی ظلم و زیادتی پر آمادہ نہیں ہوتا۔ جنگ کے سخت لمحوں میں بھی اپنے ان اصولوں کی پیروی نہیں چھوڑتا جن کی دعوت دینے کے لیے وہ اٹھا ہے۔ سچائی و وفائے عہد اور حسنِ معاملت پر ہر حال میں قائم رہتا ہے۔ بے لاگ انصاف کرتا ہے اور امانت و دیانت کے اس معیار پر پورا اترتا ہے جسے ابتداً اس نے دنیا کے سامنے معیار کی حیثیت سے پیش کیا تھا۔ مخالفین کی زانی، شرابی، جواری اور سنگدل بے رحم فوجوں سے جب اس گروہ کے خداترس، پاکباز، عبادت گذار، نیک دل اور رحیم و کریم مجاہدین کا مقابلہ پیش آتا ہے تو فرداً فرداً ان کی انسانیت اُن کی درندگی و حیوانیت پر فائق نظر آتی ہے۔ وہ ان کے پاس زخمی یا قیدی بن کر آتے ہیں تو یہاں ہر طرف نیکی شرافت اور پاکیزگی اخلاق کا ماحول دیکھ کر ان کی آلودۂ نجاست روحیں بھی پاک ہونے لگتی ہیں، اور یہ وہاں گرفتار ہو جاتے ہیں تو ان کا جوہرِ انسانیت اس تاریک ماحول میں اور زیادہ چمک اٹھتا ہے۔ ان کو کسی علاقے پر غلبہ حاصل ہوتا ہے تو مفتوح آبادی کو انتقام کی جگہ عفو، ظلم و جور کی جگہ رحم و انصاف، شقاوت کی جگہ ہمدردی، تکبر و نخوت کی جگہ حلم و تواضع، گالیوں کی جگہ دعوتِ خیر و جھوٹے پروپیگنڈوں کی جگہ اصولِ حق کی تبلیغ کا تجربہ ہوتا ہے اور وہ یہ دیکھ کر عش عش کرنے لگتے ہیں کہ فاتح سپاہی نہ ان سے عورتیں مانگتے ہیں، نہ دبے چھپے مال ٹٹولتے پھرتے ہیں، نہ ان کے صنعتی راز و ں کا سراغ لگاتے ہیں، نہ ان کی معاشی طاقت کو کچلنے کی فکر کرتے ہیں، نہ ان کی قومی عزت کو ٹھوکر مارتے ہیں بلکہ انھیں اگر کچھ فکر ہے تو یہ کہ جو ملک اب ان کے چارج میں ہے اس کے باشندوں میں سے کسی کی عصمت خراب نہ ہو، کسی کے مال کو نقصان نہ پہنچے، کوئی اپنے جائز حقوق سے محروم نہ ہو، کوئی بد اخلاقی ان کے درمیان پرورش نہ پا سکے اور اجتماعی ظلم و جور کسی شکل میں بھی وہاں باقی نہ رہے۔ بخلاف اس کے جب فریقِ مخالف کسی علاقہ میں گھس آتا ہے تو ساری آبادی اُس کی زیادتیوں، بے رحمیوں سے چیخ اٹھتی ہے۔ اب آپ خود ہی اندازہ کر لیں کہ ایسی لڑائی میں قوم پرستانہ

لڑائیوں کی بہ نسبت کتنا بڑا فرق واقع ہوجاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے مقابلہ میں بالاتر انسانیت کم تر مادی سروسامان کے باوجود اپنے مخالفوں کی آہن پوش حیوانیت کو آخر کار شکست دے کر رہے گی، اخلاق فاضلہ کے ہتھیار توپ و تفنگ سے زیادہ دور مار ثابت ہوں گے عین حالت جنگ میں دشمن دوستوں میں تبدیل ہوں گے، جسموں سے پہلے دل مسخر ہوں گے، آبادیاں کی آبادیاں لڑے بھڑے بغیر مفتوح ہوجائیں گی، اور یہ صالح گروہ جب ایک مرتبہ مٹھی بھر جمعیت اور تھوڑے سے سروسامان کے ساتھ کام شروع کر دے گا تو رفتہ رفتہ خود مخالف کیمپ ہی سے اس کو جنرل، سپاہی، ماہرین فنون، اسلحہ، رسد، سامان جنگ سب کچھ حاصل ہوتے چلے جائیں گے۔

یہ جو کچھ میں عرض کر رہا ہوں یہ نرا قیاس اور اندازہ نہیں ہے بلکہ اگر آپ کے سامنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے دور مبارک کی تاریخی مثال موجود ہو تو آپ پر واضح ہوجائے گا کہ فی الواقع اس سے پہلے یہی کچھ ہو چکا ہے اور آج بھی یہی کچھ ہو سکتا ہے بشرطیکہ کسی میں یہ تجربہ کرنے کی ہمت ہو۔

حضرات! مجھے توقع ہے کہ اس تقریر سے یہ حقیقت آپ کے ذہن نشین ہو گئی ہوگی کہ طاقت کا اصل منبع اخلاقی طاقت ہے اور اگر دنیا میں کوئی منظم گروہ ایسا موجود ہو جو بنیادی اخلاقیات کے ساتھ اسلامی اخلاقیات کا زور بھی اپنے اندر رکھتا ہو تو یہ بات عقلاً محال اور فطرۃً غیر ممکن ہے کہ اس کی موجودگی میں کوئی دوسرا گروہ دنیا کی امامت و قیادت پر قابض رہ سکے۔ اس کے ساتھ مجھے امید ہے کہ آپ نے یہ بھی اچھی طرح سمجھ لیا ہوگا کہ مسلمانوں کی موجودہ پست حالی کا اصل سبب کیا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جو لوگ نہ مادی وسائل سے کام لیں، نہ بنیادی وسائل سے کام لیں، نہ بنیادی اخلاقیات سے آراستہ ہوں اور نہ اجتماعی طور پر ان کے اندر اسلامی اخلاقیات ہی پائے جائیں وہ کسی طرح امامت کے منصب پر فائز نہیں رہ سکتے اور خدا کی اٹل بے لاگ سنت کا تقاضا یہی ہے کہ ان پر ایسے کافروں کو ترجیح دی جائے جو اسلامی اخلاقیات سے عاری سہی مگر کم از کم بنیادی اخلاقیات اور مادی وسائل کے استعمال میں تو اپنے آپ کو ان کی بہ نسبت انتظام دنیا کے لیے اہل تر ثابت کر رہے ہیں۔ اس معاملہ میں اگر آپ کو کوئی شکایت ہو تو سنت اللہ سے نہیں بلکہ اپنے آپ سے ہونی چاہیے اور اس شکایت کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ آپ اب اپنی اس خامی کو دور کرنے کی فکر کریں جس نے آپ کو امام سے مقتدی اور پیش رو سے پس رو بنا کر چھوڑا ہے۔

اس کے بعد ضرورت ہے کہ میں صاف اور واضح طریقہ سے آپ کے سامنے اسلامی اخلاقیات کی بنیادوں کو بھی پیش کر دوں، کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ اس معاملہ میں عام طور پر مسلمانوں کے تصورات بری طرح الجھے ہوئے ہیں اور اس الجھن کی وجہ سے بہت ہی کم آدمی یہ جانتے ہیں کہ اسلامی اخلاقیات فی الواقع کس چیز کا نام ہے اور اس پہلو سے انسان کی تربیت و تکمیل کے لیے کیا چیزیں کس ترتیب و تدریج کے ساتھ اس کے اندر پرورش کی جانی چاہییں۔

قرآن اور حدیث کی رو سے جس چیز کو ہم اسلامی اخلاقیات کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں وہ دراصل چار مراتب پر مشتمل ہے: ایمان، اسلام، تقویٰ، اور احسان۔ یہ چاروں مراتب یکے بعد دیگرے اس فطری ترتیب پر واقع ہیں کہ ہر بعد کا مرتبہ پہلے مرتبے سے پیدا اور لازماً اسی پر قائم ہوتا ہے، اور جب تک نیچے والی منزل پختہ و مستحکم نہ ہو جائے دوسری منزل کی تعمیر کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا۔ اس پوری عمارت میں ایمان کو بنیاد کی حیثیت حاصل ہے، اس بنیاد پر اسلام کی منزل تعمیر ہوتی ہے، پھر اس کے اوپر تقویٰ اور سب کے اوپر احسان کی منزلیں اٹھتی ہیں۔ ایمان نہ ہو تو اسلام و تقویٰ یا احسان کا سرے سے کوئی امکان ہی نہیں۔ ایمان کمزور ہو تو اس پر کسی بالائی منزل کا بوجھ نہیں ڈالا جا سکتا، یا ایسی کوئی منزل تعمیر کر بھی دی جائے تو وہ بودی اور متزلزل ہوگی۔ ایمان محدود ہو تو جتنے حدود میں وہ محدود ہوگا، اسلام، تقویٰ

اور احسان بھی بس اُنہی حدود تک محدود رہیں گے۔ پس جب تک ایمان پوری طرح صحیح، پختہ اور وسیع نہ ہو، کوئی مرد عاقل جو دین کا فہم رکھتا ہو، اسلام، تقویٰ یا احسان کی تعمیر کا خیال نہیں کر سکتا۔ اسی طرح تقویٰ سے پہلے اسلام اور احسان سے پہلے تقویٰ کی تصحیح، پختگی اور توسیع ضروری ہے۔ لیکن اکثر ہم دیکھتے ہیں کہ لوگ اس فطری و اصولی ترتیب کو نظر انداز کر کے ایمان و اسلام کی تکمیل کے بغیر تقویٰ و احسان کی باتیں شروع کر دیتے ہیں، اور اس سے بھی زیادہ افسوسناک یہ ہے کہ بالعموم لوگوں کے ذہنوں میں ایمان و اسلام کا ایک نہایت محدود تصور جاگزیں ہے اس وجہ سے وہ سمجھتے ہیں کہ محض وضع قطع، لباس، نشست و برخاست، اکل و شرب اور ایسی ہی چند ظاہری چیزوں کو ایک مقرر نقشے پر ڈھال لینے سے تقویٰ کی تکمیل ہو جاتی ہے، اور پھر عبادات میں نوافل، اذکار، اَوْرَاد اور ایسے ہی بعض اعمال اختیار کر لینے سے احسان کا بلند مقام حاصل ہو جاتا ہے، حالانکہ بسا اوقات اسی تقویٰ اور احسان کے ساتھ ساتھ لوگوں کی زندگیوں میں ایسی صریح علامات بھی نظر آتی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ ابھی ان کا ایمان ہی سرے سے درست اور پختہ نہیں ہوا ہے۔ یہ غلطیاں جب تک موجود ہیں، کسی طرح یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ ہم اسلامی اخلاقیات کا نصاب پورا کرنے میں کبھی کامیاب ہو سکیں گے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ ہمیں ایمان، اسلام، تقویٰ اور احسان کے ان چاروں مراتب کا پورا پورا تصور بھی حاصل ہو اور اس کے ساتھ ہم ان کی فطری ترتیب کو بھی اچھی طرح سمجھ لیں۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے ایمان کو لیجیے جو اسلامی زندگی کی بنیاد ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ توحید و رسالت کے اقرار کا نام ایمان ہے اگر کوئی شخص اس کا اقرار کرلے تو اس سے وہ قانونی شرط پوری ہو جاتی ہے جو دائرۂ اسلام میں داخل ہونے کے لیے رکھی گئی ہے اور وہ اس کا مستحق ہو جاتا ہے کہ اس کے ساتھ مسلمانوں کا سا معاملہ کیا جائے۔ مگر کیا یہی سادہ اقرار، جو ایک قانونی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے کافی ہے، اس غرض کے لیے بھی کافی ہو سکتا ہے کہ اسلامی زندگی کی ساری سہ منزلہ عمارت صرف اسی بنیاد پر قائم ہو سکے؟ لوگ ایسا ہی سمجھتے ہیں اور اسی لیے جہاں یہ اقرار موجود ہوتا ہے وہاں عملی اسلام اور تقویٰ اور احسان کی تعمیر شروع کر دی جاتی ہے جو اکثر ہوائی قلعے سے زیادہ پائیدار ثابت نہیں ہوتی۔ لیکن فی الواقع ایک مکمل اسلامی زندگی کی تعمیر کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ ایمان اپنی تفصیلات میں پوری طرح وسیع اور اپنی گہرائی میں اچھی طرح مستحکم ہو۔ اس کی تفصیلات میں سے جو شعبہ بھی چھوٹ جائے گا، اسلامی زندگی کا وہی شعبہ تعمیر ہونے سے رہ جائے گا، اور اس کی گہرائی میں جہاں بھی کسر رہ جائے گی اسلامی زندگی کی عمارت اسی مقام پر بودی ثابت ہوگی۔ مثال کے طور پر ایمان باللہ کو دیکھیے جو دین کی اولین بنیاد ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ خدا کا اقرار اپنی سادہ صورت سے گزر کر جب تفصیلات میں پہنچتا ہے تو اس کی بے شمار صورتیں بن جاتی ہیں۔ کہیں وہ صرف اس حد پر ختم ہو جاتا ہے کہ بے شک خدا موجود ہے اور وہ دنیا کا خالق ہے اور اپنی ذات میں اکیلا ہے۔ کہیں اس کی انتہائی وسعت بس اتنی ہوتی ہے کہ خدا ہمارا معبود ہے اور ہمیں اس کی پرستش کرنی چاہیے۔ کہیں خدا کی صفات اور اس کے حقوق و اختیارات کا تصور کچھ زیادہ وسیع ہو کر بھی وہ اس سے آگے نہیں بڑھتا کہ عالم الغیب، سمیع و بصیر، سمیع الدعوات و قاضی الحاجات اور پرستش کی تمام جزوی شکلوں کا مستحق ہونے میں خدا کا کوئی شریک نہیں ہے، اور یہ کہ "مذہبی معاملات" میں آخری سند خدا ہی کی کتاب ہے ظاہر ہے کہ ان مختلف تصورات سے ایک ہی طرز کی زندگی نہیں بن سکتی بلکہ جو تصور جتنا محدود ہے، عملی زندگی اور اخلاق میں بھی لازماً اسلامی رنگ اتنا ہی محدود ہو گا، حتیٰ کہ جہاں عام مذہبی تصورات کے مطابق ایمان باللہ اپنی انتہائی وسعت پر پہنچ جائے گا وہاں بھی اسلامی زندگی اس سے آگے نہ بڑھ سکے گی کہ خدا کے باغیوں کی وفاداری اور خدا کی وفاداری ایک ہی ساتھ نباہی جائے،

یا نظامِ کفر اور نظامِ اسلام کو گڈمڈ کر کے ایک مرکب بنا لیا جائے۔ اسی طرح ایمان باللہ کی گہرائی کا پیمانہ بھی مختلف لوگوں میں مختلف ہے۔ کوئی خدا کا اقرار کرنے کے باوجود اپنی کسی معمولی سے معمولی چیز کو بھی خدا پر قربان کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتا، کوئی بعض چیزوں سے خدا کو عزیز تر رکھتا ہے مگر بعض چیزیں اسے خدا سے عزیز تر ہوتی ہیں، کوئی اپنی جان و مال تک خدا پر قربان کر دیتا ہے مگر اپنے رجحانات نفس اور اپنے نظریات و افکار کی قربانی یا اپنی شہرت کی قربانی اسے گوارا نہیں ہوتی۔ ٹھیک ٹھیک اسی تناسب سے اسلامی زندگی کی پائیداری و ناپائیداری بھی متعین ہوتی ہے، اور انسان کا اسلامی اخلاق ٹھیک اُسی مقام پر دغا دے جاتا ہے جہاں اس کے نیچے ایمان کی بنیاد کمزور رہ جاتی ہے۔ ایک مکمل اسلامی زندگی کی عمارت اگر اٹھ سکتی ہے تو صرف اُسی اقرارِ توحید پر اٹھ سکتی ہے جو انسان کی پوری انفرادی و اجتماعی زندگی پر وسیع ہو، جس کے مطابق انسان اپنے آپ کو اور اپنی ہر چیز کو خدا کی ملک سمجھے، اس کو اپنا اور تمام دنیا کا ایک ہی جائز مالک، معبود، مطاع اور صاحب امر و نہی تسلیم کرے، اسی کو ہدایت کا سرچشمہ مانے، اور پورے شعور کے ساتھ اس حقیقت پر مطمئن ہو جائے کہ خدا کی اطاعت سے انحراف، یا اس کی ہدایت سے بے نیازی، یا اس کی ذات و صفات اور حقوق و اختیارات میں غیر کی شرکت جس پہلو اور جس رنگ میں بھی ہے سراسر ضلالت ہے۔ پھر اس عمارت میں استحکام اگر پیدا ہو سکتا ہے تو صرف اس وقت ہو سکتا ہے کہ آدمی پورے شعور اور پورے ارادے کے ساتھ یہ فیصلہ کر لے کہ وہ اور اس کا سب کچھ اللہ کا ہے اور اللہ ہی کے لیے ہے۔ اپنے معیارِ پسند اور ناپسند کو ختم کر کے اللہ کی پسند و ناپسند کے تابع کر دے۔ اپنی خود سری کو مٹا کر اپنے نظریات، خیالات، خواہشات، جذبات، اور اندازِ فکر کو اُس علم کے مطابق ڈھال لے جو خدا نے اپنی کتاب میں دیا ہے۔ اپنی تمام ان وفاداریوں کو دریا بُرد کر دے جو خدا کی وفاداری کی تابع نہیں بلکہ اس کی مد مقابل بن سکتی ہوں۔ اپنے دل میں سب سے بلند مقام پر خدا کی محبت کو بٹھائے اور ہر اس بت کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نہاں خانۂ دل سے نکال پھینکے جو خدا کے مقابلہ میں عزیز تر ہونے کا مطالبہ کرتا ہو۔ اپنی محبت اور نفرت، اپنی دوستی اور دشمنی، اپنی رغبت اور کراہیت، اپنی صلح اور جنگ ہر چیز کو خدا کی مرضی میں اس طرح گم کر دے کہ اس کا نفس وہی چاہنے لگے جو خدا چاہتا ہے اور ہر اس سے بھاگنے لگے جو خدا کو ناپسند ہے۔ یہ ہے ایمان باللہ کا حقیقی مرتبہ اور آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ جہاں ایمان ہی ان حیثیات سے اپنی وسعت و ہمہ گیری اور اپنی پختگی و مضبوطی میں ناقص ہو وہاں تقویٰ یا احسان کا کیا امکان ہو سکتا ہے۔ کیا اس نقص کی کسر ڈاڑھیوں کے طول اور لباس کی تراش خراش یا تسبیح گردانی و تہجد خوانی سے پوری کی جا سکتی ہے؟

اسی پر دوسرے ایمانیات کو بھی قیاس کر لیجیے۔ نبوت پر ایمان اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک انسان کا نفس زندگی کے سارے معاملات میں نبی کو اپنا رہنما نہ مان لے اور اس کی رہنمائی کے خلاف یا اس سے آزاد جتنی رہنمائیاں ہوں ان کو رد نہ کر دے۔ کتاب پر ایمان اس وقت تک ناقص ہی رہتا ہے جب تک نفس میں کتاب اللہ کے بتائے ہوئے اصولِ زندگی کے سوا کسی دوسری چیز کے تسلط پر رضامندی کا شائبہ بھی باقی ہو یا اتباع ما انزل اللہ کو اپنی اور ساری دنیا کی زندگی کا قانون دیکھنے کے لیے قلب و روح کی بے چینی میں کچھ بھی کسر ہو۔ اسی طرح آخرت پر ایمان بھی مکمل نہیں کہا جا سکتا جب تک نفس پوری طرح آخرت کو دنیا پر ترجیح دینے اور اخروی قدروں کے مقابلہ میں دنیوی قدروں کو ٹھکرا دینے پر آمادہ نہ ہو جائے اور آخرت کی جوابدہی کا خیال اسے زندگی کی ہر راہ پر چلتے ہوئے قدم قدم پر کھٹکنے نہ لگے۔ یہ بنیادیں ہی جہاں پوری طرح موجود نہ ہوں آخر وہاں اسلامی زندگی کی عالیشان عمارت کس شے پر تعمیر ہو گی۔ جب لوگوں نے ان بنیادوں کی توسیع و تکمیل اور پختگی کے بغیر ہی تعمیرِ اخلاقِ اسلامی کو ممکن سمجھا تب ہی تو نوبت یہاں تک پہنچی کہ کتاب اللہ

کے خلاف فیصلہ کرنے والے جج، غیر شرعی قوانین کی بنیاد پر مقدمے لڑانے والے وکیل، نظام کفر کے ماتحت معاملات زندگی کا انتظام کرنے والے کارکن، کافرانہ اصول تمدن و سیاست پر زندگی کی تشکیل و تاسیس کے لیے لڑنے والے لیڈر اور پیرو، غرض سب کے لیے تقویٰ و احسان کے مراتب عالیہ کا دروازہ کھل گیا بشرطیکہ یہ اپنی زندگی کے ظاہری انداز و اطوار کو ایک خاص نقشے پر ڈھال لیں، اور کچھ نوافل و اذکار کی عادت ڈال لیں۔

ایمان کی یہ بنیادیں، جن کا ابھی میں نے آپ سے ذکر کیا ہے، جب مکمل اور گہری ہو جاتی ہیں، تب ان پر اسلام کی منزل تعمیر ہوتی ہے۔ اسلام دراصل ایمان کے عملی ظہور کا دوسرا نام ہے۔ ایمان اور اسلام کا باہمی تعلق ویسا ہی ہے جیسا بیج اور درخت کا تعلق ہوتا ہے۔ بیج میں جو کچھ اور جیسا کچھ موجود ہوتا ہے وہی درخت کی شکل میں ظاہر ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ درخت کا امتحان کر کے بآسانی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ بیج میں کیا تھا اور کیا نہ تھا۔ آپ یہ تصور کر سکتے ہیں کہ بیج نہ ہو اور درخت موجود ہو، اور نہ یہ ممکن ہے کہ بیج تو ہو اور بیج اس میں موجود ہو پھر بھی درخت پیدا نہ ہو۔ ایسا ہی معاملہ ایمان اور اسلام کا ہے۔ جہاں ایمان موجود ہوگا، لازماً اس کا ظہور آدمی کی عملی زندگی میں، اخلاق میں، برتاؤ میں، تعلقات کے لگاؤ، چلنے میں، دوڑ دھوپ کے رخ میں، مذاق و مزاج کی افتاد میں، سعی و جہد کے راستوں میں، اوقات اور محنتوں اور قابلیتوں کے مصرف میں، غرض مظاہر زندگی کے ہر ہر جز میں ہو کر رہے گا۔ ان میں سے جس پہلو میں بھی اسلام کے بجائے غیر اسلام ظاہر ہو رہا ہو، یقین کر لیجیے کہ اس پہلو میں ایمان موجود نہیں ہے یا ہے تو بالکل بودا اور بے جان ہے، اور اگر عملی زندگی ساری کی ساری ہی غیر مسلمانہ شان سے بسر ہو رہی ہو، تو جان لیجیے کہ دل ایمان سے خالی ہے یا زمین اتنی بنجر ہے کہ ایمان کا بیج برگ و بار نہیں لا رہا ہے۔ بہرحال میں نے جہاں تک قرآن اور حدیث کو سمجھا ہے، یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ دل میں ایمان ہو اور عمل میں اسلام نہ ہو۔

(اس موقع پر ایک صاحب نے اٹھ کر پوچھا کہ ایمان اور عمل کو آپ ایک ہی چیز سمجھتے ہیں یا ان دونوں میں کچھ فرق ہے۔ اس کے جواب میں کہا:)

آپ تھوڑی دیر کے لیے اپنے ذہن سے ان بحثوں کو نکال دیں جو فقہاء اور متکلمین نے اس مسئلہ میں کی ہیں اور قرآن سے اس معاملہ کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ قرآن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اعتقادی ایمان اور عملی اسلام لازم و ملزوم ہیں۔ اللہ تعالیٰ جگہ جگہ ایمان اور عمل صالح کا ساتھ ساتھ ذکر کرتا ہے اور تمام اچھے وعدے جو اس نے اپنے بندوں سے کیے ہیں انھی لوگوں سے متعلق ہیں جو اعتقاداً مومن اور عملاً مسلم ہوں۔ پھر آپ دیکھیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں جہاں منافقین کو پکڑا ہے وہاں ان کے عمل ہی کی خرابیوں سے ان کے ایمان کے نقص پر دلیل قائم کی ہے اور عملی اسلام ہی کو حقیقی ایمان کی علامت ٹھیرایا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قانونی لحاظ سے کسی شخص کو کافر ٹھیرانے اور ملت سے اس کا رشتہ کاٹنے کا معاملہ دوسرا ہے اور اس میں انتہائی احتیاط ملحوظ رہنی چاہیے، مگر میں یہاں اس ایمان و اسلام کا ذکر نہیں کر رہا ہوں جس پر دنیا میں فقہی احکام مترتب ہوتے ہیں، بلکہ یہاں ذکر اس ایمان و اسلام کا ہے جو خدا کے ہاں معتبر ہے اور جس پر اخروی نتائج مترتب ہونے والے ہیں۔ قانونی نقطۂ نظر کو چھوڑ کر حقیقت نفس الامری کے لحاظ سے اگر آپ دیکھیں گے تو یقیناً یہی پائیں گے کہ جہاں عملاً خدا کے آگے سپر اندازی اور سپردگی و حوالگی میں کمی ہے، جہاں نفس کی پسند خدا کی پسند سے مختلف ہے، جہاں خدا کی وفاداری کے ساتھ غیر کی وفاداری نبھ رہی ہے، جہاں اقامت دین کی سعی کے بجائے دوسرے مشاغل میں انہماک ہے، جہاں کوششیں اور محنتیں راہ خدا کے بجائے دوسری راہوں میں صرف ہو رہی ہیں، وہاں ضرور ایمان میں نقص ہے اور ظاہر ہے کہ ناقص ایمان پر تقویٰ اور احسان کی تعمیر نہیں ہو سکتی خواہ ظاہر کے اعتبار سے متقیوں کی سی وضع بنانے اور محسنین کے بعض اعمال کی نقل اتارنے کی کتنی ہی کوشش کی جائے۔ ظاہر فریب شکلیں اگر حقیقت کی روح سے خالی ہوں تو ان کی مثال بالکل ایسی ہے جیسی ایک نہایت خوشنما

آدمی کی لاش بہترین وضع وہیئت میں موجود ہو مگر اس میں جان نہ ہو۔ اس خوبصورت لاش کی ظاہری شان سے دھوکا کھا کر آپ کچھ توقعات اس سے وابستہ کریں گے تو واقعات کی دنیا اپنے پہلے ہی امتحان میں اس کا ناکارہ ہونا ثابت کر دے گی اور تجربے سے آپ کو خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ ایک بدصورت مگر زندہ انسان ایک خوبصورت مگر بے روح لاش سے بہرحال زیادہ کارگر ہوتا ہے۔ ظاہر فریبیوں سے آپ اپنے نفس کو تو ضرور دھوکا دے سکتے ہیں، لیکن عالم واقعہ پر کچھ بھی اثر نہیں ڈال سکتے اور نہ خدا کی میزان ہی میں کوئی وزن حاصل کر سکتے ہیں۔ پس اگر آپ کو ظاہری نہیں بلکہ وہ حقیقی تقویٰ اور احسان مطلوب ہو جو دنیا میں دین کا بول بالا کرنے اور آخرت میں خیر کا پلڑا جھکانے کے لیے درکار ہے، تو میری اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے کہ اوپر کی یہ دونوں منزلیں کبھی نہیں اٹھ سکتیں جب تک ایمان کی بنیاد مضبوط نہ ہو جائے اور اس کی مضبوطی کا ثبوت عملی اسلام یعنی بالفعل اطاعت و فرمانبرداری سے نہ مل جائے۔

تقویٰ کی بات کرنے سے پہلے یہ سمجھنے کی کوشش کیجیے کہ تقویٰ ہے کیا چیز۔ تقویٰ حقیقت میں کسی وضع و ہیئت اور کسی خاص طرزِ معاشرت کا نام نہیں ہے بلکہ دراصل وہ نفس کی اس کیفیت کا نام ہے جو خدا ترسی اور احساس ذمہ داری سے پیدا ہوتی ہے اور زندگی کے ہر پہلو میں ظہور کرتی ہے۔ حقیقی تقویٰ یہ ہے کہ انسان کے دل میں خدا کا خوف ہو، عبدیت کا شعور ہو، خدا کے سامنے اپنی ذمہ داری و جواب دہی کا احساس ہو، اور اس بات کا زندہ ادراک موجود ہو کہ دنیا ایک امتحان گاہ ہے جہاں خدا نے ایک مہلتِ عمر دے کر مجھے بھیجا ہے اور آخرت میں میرے مستقبل کا فیصلہ بالکل اس چیز پر منحصر ہے کہ میں اس دیے ہوئے وقت کے اندر اس امتحان گاہ میں اپنی قوتوں اور قابلیتوں کو کس طرح استعمال کرتا ہوں، اس سروسامان میں کس طرح تصرف کرتا ہوں جو مشیت الٰہی کے تحت مجھے دیا گیا ہے، اور ان انسانوں کے ساتھ کیا معاملہ کرتا ہوں جن سے قضائے الٰہی نے مختلف حیثیتوں سے میری زندگی متعلق کر دی ہے۔ یہ احساس و شعور جس شخص کے اندر پیدا ہو جائے اُس کا ضمیر بیدار ہو جاتا ہے، اس کی دینی حس تیز ہو جاتی ہے، اس کو ہر وہ چیز کھٹکنے لگتی ہے جو خدا کی رضا کے خلاف ہو، اُس کے مذاق کو ہر وہ شے ناگوار ہونے لگتی ہے جو خدا کی پسند سے مختلف ہو۔ وہ اپنے نفس کا آپ جائزہ لینے لگتا ہے کہ میرے اندر کس قسم کے رجحانات و میلانات پرورش پا رہے ہیں۔ وہ اپنی زندگی کا خود محاسبہ کرنے لگتا ہے کہ میں کن کاموں میں اپنا وقت اور اپنی قوتیں صرف کر رہا ہوں۔ وہ صریح ممنوعات کو تو درکنار مشتبہ امور میں بھی مبتلا ہوتے ہوئے خود بخود جھجکنے لگتا ہے۔ اس کا احساسِ فرض اسے مجبور کر دیتا ہے کہ تمام اوامر کو پوری فرمانبرداری کے ساتھ بجا لائے۔ اس کی خدا ترسی ہر اس موقع پر اس کے قدم میں لرزش پیدا کر دیتی ہے جہاں حدود اللہ سے تجاوز کا اندیشہ ہو۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی نگہداشت آپ سے آپ اس کا وتیرہ بن جاتی ہے اور اس خیال سے بھی اس کا ضمیر کانپ اٹھتا ہے کہ کہیں اس سے کوئی بات حق کے خلاف سرزد نہ ہو جائے۔ یہ کیفیت کسی ایک شکل یا کسی مخصوص دائرۂ عمل میں ہی ظاہر نہیں ہوتی بلکہ آدمی کے پورے طرزِ فکر اور اس کے تمام کارنامۂ زندگی میں اس کا ظہور ہوتا ہے اور اس کے اثر سے ایک ایسی ہموار و یک رنگ سیرت پیدا ہوتی ہے جس میں آپ ہر پہلو سے ایک ہی طرز کی پاکیزگی و صفائی پائیں گے۔ بخلاف اس کے جہاں تقویٰ اس چیز کا نام رکھ لیا گیا ہے کہ آدمی چند مخصوص شکلوں کی پابندی اور مخصوص طریقوں کی پیروی اختیار کرنے اور مصنوعی طور پر اپنے آپ کو ایک ایسے سانچے میں ڈھال لے جس کی پیمائش کی جا سکتی ہو، وہاں آپ دیکھیں گے کہ وہ چند اشکالِ تقویٰ جو گنا دی گئی ہیں، ان کی پابندی تو انتہائی اہتمام کے ساتھ ہو رہی ہے، مگر اس کے ساتھ زندگی کے دوسرے پہلوؤں میں وہ اخلاق، وہ طرزِ فکر اور وہ طرزِ عمل بھی ظاہر ہو رہے ہیں جو مقام تقویٰ تو درکنار، ایمان کے ابتدائی مقتضیات سے بھی مناسبت نہیں رکھتے، یعنی حضرت مسیحؑ کی تمثیلی زبان میں مچھر چھانے جا رہے ہیں اور اونٹ ... سالم نگلے جا رہے ہیں۔

حقیقی تقویٰ اور مصنوعی تقویٰ کے اس فرق کو یوں سمجھیے کہ ایک شخص تو وہ ہے جس کے اندر طہارت و نظافت کی حس موجود ہے اور

پاکیزگی کا ذوق پایا جاتا ہے۔ ایسا شخص گندگی سے فی نفسہٖ نفرت کرے گا خواہ وہ جس شکل میں بھی ہو اور طہارت کو بجائے خود اختیار کرے گا خواہ اس کے مظاہر کا احاطہ نہ ہو سکتا ہو۔ بخلاف اس کے ایک دوسرا شخص ہے جس کے اندر طہارت کی حس موجود نہیں ہے مگر وہ گندگیوں اور طہارتوں کی ایک فہرست لیے پھرتا ہے جو کہیں سے اس نے نقل کر لی ہیں۔ یہ شخص ان گندگیوں سے تو سخت اجتناب کرے گا جو اس کی فہرست میں لکھی ہوئی ہیں، مگر بے شمار ایسی گھناؤنی چیزوں میں آلودہ پایا جائے گا جو ان گندگیوں سے بدرجہا زیادہ ناپاک ہوں گی جس سے وہ بچ رہا ہے صرف اس وجہ سے کہ وہ اس کی فہرست میں درج ہونے سے رہ گئیں۔ یہ فرق جو میں آپ سے عرض کر رہا ہوں، یہ محض ایک نظری فرق نہیں ہے بلکہ آپ اس کو اپنی آنکھوں سے ان حضرات کی زندگیوں میں دیکھ سکتے ہیں جن کے تقویٰ کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ ایک طرف ان کے ہاں جزئیاتِ شرع کا یہ اہتمام ہے کہ داڑھی ایک خاص مقدار سے کچھ بھی کم ہو تو فسق کا فیصلہ نافذ کر دیا جاتا ہے، پائنچہ ٹخنے سے ذرا نیچے ہو جائے تو جہنم کی وعید سنا دی جاتی ہے، اپنے مسلک فقہی کے فروعی احکام سے ہٹنا ان کے نزدیک گویا دین سے نکل جانا ہے۔ لیکن دوسری طرف دین کے اصول و کلیات سے ان کی غفلت، اس حد کو پہنچی ہوئی ہے کہ مسلمانوں کی پوری زندگی کا مدار انھوں نے رخصتوں اور سیاسی مصلحتوں پر رکھ دیا ہے، اقامت دین کی سعی سے گریز کی بے شمار راہیں انھوں نے نکال رکھی ہیں، غلبۂ کفر کے تحت "اسلامی زندگی" کے نقشے بنانے ہی میں ان کی ساری محنتیں اور کوششیں صرف ہو رہی ہیں، اور انہی کی غلط رہنمائی نے مسلمانوں کو اس چیز پر مطمئن کیا ہے کہ ایک غیر اسلامی نظام کے اندر رہتے ہوئے، بلکہ اس کی خدمت کرتے ہوئے بھی ایک محدود دائرے میں مذہبی زندگی بسر کر کے وہ دین کے سارے تقاضے پورے کر سکتے ہیں اور اس سے آگے کچھ مطلوب نہیں ہے جس کے لیے وہ سعی کریں۔ پھر اس سے بھی زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ اگر کوئی ان کے سامنے دین کے اصلی مطالبے پیش کرے اور سعی اقامت دین کی طرف توجہ دلائے تو صرف یہی نہیں کہ وہ اس کی بات سنی ان سنی کر دیتے ہیں بلکہ کوئی حیلہ، کوئی بہانہ اور کوئی چال ایسی نہیں چھوڑتے جو اس کام سے خود بچنے اور مسلمانوں کو بچانے کے لیے استعمال نہ کریں۔ اس پر بھی ان کے تقویٰ پر کوئی آنچ نہیں آتی اور نہ مذہبی ذہنیت رکھنے والوں میں سے کسی کو یہ شک ہوتا کہ ان کے تقویٰ میں کوئی کسر ہے۔ اس کے علاوہ حقیقی اور مصنوعی تقویٰ کا فرق بے شمار دوسری شکلوں میں بھی ظاہر ہوتا رہتا ہے جسے آپ محسوس کر سکتے ہیں بشرطیکہ تقویٰ کا اصلی تصور آپ کے ذہن میں واضح طور پر موجود ہو۔

میری ان باتوں کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ وضع قطع، لباس اور معاشرت کے ظاہری پہلوؤں کے متعلق جو آداب و احکام حدیث سے ثابت ہیں، میں ان کا استخفاف کرنا چاہتا ہوں، یا انھیں غیر ضروری قرار دیتا ہوں۔ خدا کی پناہ اس سے کہ میرے دل میں ایسا کوئی خیال ہو۔ دراصل جو کچھ میں آپ کے ذہن نشین کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اصل شے حقیقتِ تقویٰ ہے نہ کہ یہ مظاہر۔ حقیقتِ تقویٰ جس کے اندر پیدا ہو گی تو اس کی پوری زندگی ہمواری و یک رنگی کے ساتھ اسلامی زندگی بنے گی اور اسلام اپنی پوری ہمہ گیری کے ساتھ اس کے خیالات میں، اس کے جذبات و رجحانات میں، اس کے مذاقِ طبیعت میں، اس کے اوقات کی تقسیم اور اس کی قوتوں کے مصارف میں، اس کی سعی کی راہوں میں، اس کے طرزِ زندگی اور معاشرت میں، اس کی کمائی اور خرچ میں، غرض اس کی حیاتِ دنیوی کے سارے ہی پہلوؤں میں رفتہ رفتہ نمایاں ہوتا چلا جائے گا۔ بخلاف اس کے اگر مظاہر کو حقیقت پر مقدم رکھا جائے گا اور ان پر بے جا زور دیا جائے گا اور حقیقی تقویٰ کی تخم ریزی و آبیاری کے بغیر مصنوعی طور پر چند ظاہری احکام کی تعمیل کرا دی جائے گی تو نتائج وہی کچھ ہوں گے جن کا میں نے ابھی آپ سے ذکر کیا ہے۔ پہلی چیز دیر طلب اور صبر آزما ہے، بتدریج نشوونما پاتی اور ایک مدت کے بعد برگ و بار لاتی ہے، جس طرح بیج سے درخت

کے پیدا ہونے اور پھل پھول لانے میں کافی دیر لگا کرتی ہے، اسی لیے عجلی مزاج کے لوگ اس سے اُکتاتے ہیں۔ بخلاف اس کے دوسری چیز جلدی اور آسانی سے پیدا کرلی جاتی ہے، جیسے ایک لکڑی میں پتے اور پھل اور پھول باندھ کر درخت کی سی شکل بنادی جائے، یہی وجہ ہے کہ تقوے کی پیداوار کا یہی ڈھنگ آج مقبول ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ جو توقعات ایک فطری درخت سے پوری ہوتی ہیں وہ اس قسم کے مصنوعی درختوں سے کبھی پوری نہیں ہو سکتیں۔

اب احسان کو لیجیے جو اسلام کی بلند ترین منزل ہے۔ احسان دراصل اللہ اور اس کے رسول اور اس کے دین کے ساتھ اس قلبی لگاؤ، اس گہری محبت، اس سچی وفاداری اور فدویت و جاں نثاری کا نام ہے جو مسلمان کو فنا فی الاسلام کر دے۔ تقوےٰ کا اساسی تصور خدا کا خوف ہے جو انسان کو اس کی ناراضی سے بچنے پر آمادہ کرے اور احسان کا اساسی تصور خدا کی محبت ہے جو آدمی کو اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ابھارے۔ ان دونوں چیزوں کے فرق کو ایک مثال سے یوں سمجھیے کہ حکومت کے ملازموں میں سے ایک تو وہ لوگ ہیں جو نہایت فرض شناسی و تن دہی سے وہ تمام خدمات ٹھیک ٹھیک بجا لاتے ہیں جو ان کے سپرد کی گئی ہوں، تمام ضابطوں اور قاعدوں کی پوری پوری پابندی کرتے ہیں اور کوئی ایسا کام نہیں کرتے جو حکومت کے لیے قابلِ اعتراض ہو۔ دوسرا طبقہ ان مخلص وفاداروں اور جاں نثاروں کا ہوتا ہے جو دل و جان سے حکومت کے ہواخواہ ہوتے ہیں، صرف وہی خدمات انجام نہیں دیتے جو ان کے سپرد کی گئی ہوں بلکہ ان کے دل کو ہمیشہ یہ فکر لگی رہتی ہے کہ سلطنت کے مفاد کو زیادہ سے زیادہ کس طرح ترقی دی جائے، اور اس دھن میں فرض اور مطالبہ سے زائد کام کرتے ہیں، سلطنت پر کوئی آنچ آئے تو وہ جان و مال اور اولاد سب کچھ قربان کرنے کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں، قانون کی کہیں خلاف ورزی ہو تو ان کے دل کو چوٹ لگتی ہے، کہیں بغاوت کے آثار پائے جائیں تو وہ بے چین ہو جاتے ہیں اور اس کو فرو کرنے میں جان لڑا دیتے ہیں، جان بوجھ کر خود سلطنت کو نقصان پہنچانا تو درکنار اس کے مفاد کو کسی طرح نقصان پہنچتے دیکھنا بھی ان کے لیے ناقابلِ برداشت ہوتا ہے اور اس خرابی کے رفع کرنے میں وہ اپنی حد تک کوشش کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے، ان کی دلی خواہش یہ ہوتی ہے کہ دنیا میں بس ان کی سلطنت ہی کا بول بالا ہو اور زمین کا کوئی حصہ ایسا باقی نہ رہے جہاں اس کا پھریرا نہ اڑے۔ ان دونوں میں سے پہلی قسم کے لوگ حکومت کے متقی ہیں، اور دوسری قسم کے لوگ اس کے محسن۔ اگرچہ ترقیاں متقین کو بھی ملتی ہیں اور بہرحال ان کے نام اچھے ہی ملازموں کی فہرست میں لکھے جاتے ہیں، مگر جو سرفرازیاں محسنین کے لیے ہیں اُن میں کوئی دوسرا ان کا شریک نہیں ہوتا۔ پس اسی مثال پر اسلام کے متقیوں اور محسنوں کو بھی قیاس کر لیجیے۔ اگرچہ متقین بھی قابلِ قدر اور قابلِ اعتماد لوگ ہیں، مگر اسلام کی اصلی طاقت محسنین کا گروہ ہے، اور وہ اصلی کام جو اسلام دنیا میں کرنا چاہتا ہے اسی گروہ سے بن آسکتا ہے۔

احسان کی اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد آپ خود ہی اندازہ کرلیں کہ جو لوگ اپنی آنکھوں سے خدا کے دین کو کفر سے مغلوب دیکھیں، جن کے سامنے حدود اللہ پامال ہی نہیں بلکہ کالعدم کردی جائیں، خدا کا قانون عملاً ہی نہیں بلکہ باضابطہ منسوخ کردیا جائے، خدا کی زمین پر خدا کا نہیں بلکہ اس کے باغیوں کا بول بالا ہو رہا ہو، نظامِ کفر کے تسلط سے نہ صرف عام انسانی سوسائٹی میں اخلاق و تمدنی فساد برپا ہو بلکہ خود امتِ مسلمہ بھی نہایت سرعت کے ساتھ اخلاقی و عملی گمراہیوں میں مبتلا ہو رہی ہو، اور یہ سب کچھ دیکھ کر بھی ان کے دلوں میں نہ کوئی بے چینی پیدا ہو، نہ اس حالت کو بدلنے کے لیے کوئی جذبہ بھڑکے بلکہ اس کے برعکس وہ اپنے نفس کو اور عام مسلمانوں کو غیر اسلامی نظام کے غلبے پر اصولاً و عملاً مطمئن کر دیں، ان کا شمار آخر کار محسنین میں کس طرح ہو سکتا ہے

اور اس جرمِ عظیم کے ساتھ محض یہ بات انھیں احسان کے مقامِ عالی پر کیسے سرفراز کر سکتی ہے کہ وہ چاشت اور اشراق اور تہجد کے نوافل پڑھتے رہے، ذکر و شغل اور مراقبے کرتے رہے، حدیث و قرآن کے درس دیتے رہے، جزئیاتِ فقہ کی پابندی اور چھوٹی چھوٹی سنتوں کے اتباع کا سخت اہتمام فرماتے رہے اور تزکیۂ نفس کی خانقاہوں میں دینداری کا وہ فن سکھاتے رہے جس میں حدیث و فقہ اور تصوف کی باریکیاں تو سارے موجود تھیں مگر ایک نہ تھی تو وہ حقیقی دینداری جو "سر داد نداد دست در دستِ یزید" کی کیفیت پیدا کرے اور "بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا" کے مقامِ وفاداری پر پہنچائے۔ آپ دنیوی ریاستوں اور قوموں میں بھی وفادار اور غیر وفاداری اتنی تمیز ضرور نمایاں پائیں گے کہ اگر ملک میں بغاوت ہو جائے یا ملک کے کسی حصے پر دشمن کا قبضہ ہو جائے تو باغیوں اور دشمنوں کے تسلط کو جو لوگ جائز تسلیم کر لیں، یا ان کے تسلط پر راضی ہو جائیں، اور ان کے ساتھ مغلوبانہ مصالحت کر لیں، یا ان کی سرپرستی میں کوئی ایسا نظام بنائیں جس میں اصلی اقتدار کی باگیں انہی کے ہاتھ میں رہیں اور کچھ ضمنی حقوق و اختیارات انھیں بھی مل جائیں، تو ایسے لوگوں کو کوئی ریاست اور کوئی قوم اپنا وفادار ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتی خواہ وہ قومی فیشن کے کیسے ہی سخت پابند اور جزئی معاملات میں قومی قانون کے کتنے ہی تشدد پسند ہوں۔ آج آپ کے سامنے زندہ مثالیں موجود ہیں کہ جو ملک جرمنی کے تسلط سے نکلے ہیں وہاں ان لوگوں کے ساتھ کیا معاملہ ہو رہا ہے جنھوں نے جرمن قبضے کے زمانے میں تعاون و مصالحت کی راہیں اختیار کی تھیں۔ ان سب ریاستوں اور قوموں کے پاس وفاداری کو جانچنے کا ایک ہی معیار ہے اور وہ یہ کہ کسی شخص نے دشمن کے تسلط کی مزاحمت کس حد تک کی، اس کو مٹانے کے لیے کیا کام کیا؟ اس اقتدار کو واپس لانے کی کیا کوشش کی جس کی وفاداری کا وہ مدعی تھا۔ پھر کیا معاذ اللہ خدا کے متعلق آپ کا یہ گمان ہے کہ وہ اپنے وفاداروں کو پہچاننے کی اتنی تمیز بھی نہیں رکھتا جتنی دنیا کے ان کم عقل انسانوں میں پائی جاتی ہے؟ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ وہ بس داڑھیوں کا طول، ٹخنوں اور پائنچوں کا فاصلہ، تسبیحوں کی گردش، اوراد و وظائف اور نوافل اور مراقبے کے مشاغل اور ایسی ہی چند اور چیزیں دیکھ کر ہی دھوکا کھا جائیگا کہ آپ اس کے سچے وفادار و جاں نثار ہیں؟

حضرات! اب میں ایک آخری بات کہہ کر اپنی تقریر ختم کروں گا۔ عام مسلمانوں کے ذہن پر مدتوں کے غلط تصورات کی وجہ سے جزئیات و ظواہر کی اہمیت کچھ اس طرح چھا گئی ہے کہ دین کے اصول و کلیات اور دینداری و اخلاقِ اسلامی کے حقیقی جوہر کی طرف خواہ کتنی ہی توجہ دلائی جائے، مگر لوگوں کے دماغ پھر پھر کر انہی چھوٹے چھوٹے مسائل اور وزن اسی ظاہری چیزوں میں الجھ کر رہ جاتے ہیں جنھیں اصل دین بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ اس وبائے عام کے اثرات خود ہمارے بہت سے رفقاء اور ہمدردوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ میں اپنا پورا زور یہ سمجھانے میں صرف کرتا رہا ہوں کہ دین کی حقیقت کیا ہے، اس میں اصل اہمیت کن چیزوں کی ہے، اور اس میں مقدم کیا ہے اور موخر کیا۔ لیکن ان ساری کوششوں کے بعد جب دیکھتا ہوں یہی دیکھتا ہوں کہ وہی ظاہر پرستی اور وہی اصول سے بڑھ کر فروع کی اہمیت دماغوں پر مسلط ہے۔ آج تین روز سے میرے پاس پرچوں کی بھرمار ہو رہی ہے جن میں سارا مطالبہ بس اس کا ہے کہ جماعت کے لوگوں کی داڑھیاں بڑھوائی جائیں، پائنچے ٹخنوں سے اونچے کرائے جائیں، اور ایسے ہی دوسرے جزئیات کا اہتمام کرایا جائے۔ اس کے علاوہ بعض لوگوں کے اس خیال کا بھی مجھے علم ہوا کہ انھیں جماعت میں اس چیز کی بڑی کمی محسوس ہوتی ہے جس کو وہ "روحانیت" سے تعبیر کرتے ہیں مگر شاید خود نہیں بتا سکتے کہ وہ فی الواقع ہے کیا شے۔ اس بنا پر ان کی رائے یہ ہے کہ نصب العین اور طریقِ کار تو اس جماعت کا اختیار کیا جائے اور تزکیۂ نفس و تربیتِ روحانی کے لیے خانقاہوں کی طرف

رجوع کیا جائے۔ یہ ساری باتیں صاف بتاتی ہیں کہ ابھی تک ہماری تمام کوششوں کے باوجود لوگوں میں دین کا فہم پیدا نہیں ہوا ہے۔ میں ابھی آپ کے سامنے ایمان، اسلام، تقویٰ اور احسان کی جو تشریح عرض کر چکا ہوں اس میں اگر کوئی چیز قرآن و حدیث کی تعلیم سے تجاوز کر کے میں نے خود وضع کر دی ہو تو آپ بے تکلف اس کی نشاندہی فرما دیں۔ لیکن اگر آپ تسلیم کرتے ہیں کہ کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کی رو سے یہی ان چاروں چیزوں کی حقیقت ہے تو پھر خود ہی سوچیے کہ جہاں ایمان کے مقتضیات بھی پوری طرح متحقق نہ ہوں اور جہاں تقویٰ اور احسان کی جڑ ہی نہ پائی جاتی ہو وہاں آخر کون سی روحانیت پائی جا سکتی ہے جسے آپ تلاش کرنے جا رہے ہیں۔ رہے وہ جزئیات شرع جن کو آپ نے دین کے اولین مطالبات میں شمار کر رکھا ہے، تو ان کا حقیقی مقام میں آپ کے سامنے پھر ایک مرتبہ صاف صاف واضح کیے دیتا ہوں تاکہ میں اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاؤں۔

سب سے پہلے ٹھنڈے دل سے اس بات پر غور کیجیے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول دنیا میں کس غرض کے لیے بھیجے ہیں۔ دنیا میں آخر کس چیز کی کمی تھی، کیا خرابی پائی جاتی تھی، جسے رفع کرنے کے لیے انبیاء کو مبعوث کرنے کی ضرورت پیش آئی؟ کیا وہ یہ تھی کہ لوگ داڑھیاں نہ رکھتے تھے اور انھیں رکھوانے کے لیے رسول بھیجے گئے؟ یا یہ کہ لوگ ٹخنے ڈھانکے رہتے تھے اور انبیاء کے ذریعے سے انھیں کھلوانا مقصود تھا؟ یا وہ سنتیں، جن کے اہتمام کا آپ لوگوں میں بہت چرچا ہے، دنیا میں جاری نہ تھیں اور انہی کو جاری کرنے کے لیے انبیاء کی ضرورت تھی؟ ان سوالات پر آپ غور کریں گے تو خود ہی کہہ دیں گے کہ نہ اصل خرابیاں یہ تھیں اور نہ انبیاء کی بعثت کا اصل مقصود یہ تھا۔ پھر سوال یہ ہے کہ وہ اصلی خرابیاں کیا تھیں جنھیں دور کرنا مطلوب تھا اور وہ حقیقی بھلائیاں کیا تھیں جنھیں قائم کرنے کی ضرورت تھی؟ اس کا جواب آپ اس کے سوا اور کیا دے سکتے ہیں کہ خدا کی اطاعت و بندگی سے انحراف، خود ساختہ اصول و قوانین کی پیروی، اور خدا کے سامنے ذمہ داری و جوابدہی کا عدم احساس، وہ اصل خرابیاں تھیں جو دنیا میں رونما ہو گئی تھیں۔ اُنہی کی بدولت اخلاقِ فاسدہ پیدا ہوئے، غلط اصولِ زندگی رائج ہوئے اور زمین میں فساد برپا ہوا۔ پھر انبیاء علیہم السلام اس غرض کے لیے بھیجے گئے کہ انسانوں میں خدا کی بندگی و وفاداری اور اس کے سامنے جوابدہی کا احساس پیدا کیا جائے، اخلاق فاضلہ کو نشو و نما دیا جائے اور انسانی زندگی کا نظام ان اصولوں پر قائم کیا جائے جن سے خیر و صلاح ابھرے اور شر و فساد دبے۔ یہی ایک مقصد تمام انبیاء کی بعثت کا تھا اور آخر کار اسی مقصد کے لیے محمد صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے۔

اب دیکھیے کہ اس مقصد کی تکمیل کے لیے محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کس ترتیب و تدریج کے ساتھ کام کیا۔ سب سے پہلے آپ نے ایمان کی دعوت دی اور اس کو وسیع ترین بنیادوں پر پختہ و مستحکم فرمایا۔ پھر اس ایمان کے مقتضیات کے مطابق بتدریج اپنی تعلیم و تربیت کے ذریعے اہل ایمان میں عملی اطاعت و فرمانبرداری (یعنی اسلام)، اخلاقی طہارت (یعنی تقویٰ)، اور خدا کی گہری محبت و وفاداری (یعنی احسان) کے اوصاف پیدا کیے۔ پھر ان مخلص مومنوں کی منظم سعی و جہد سے قدیم جاہلیت کے فاسد نظام کو ہٹانا اور اس کی جگہ قانونِ خداوندی کے اخلاقی و تمدنی اصولوں پر ایک نظام صالح قائم کرنا شروع کر دیا۔ اس طرح جب یہ لوگ اپنے دل و دماغ، نفس و اخلاق، افکار و اعمال، جملہ حیثیات سے واقعی مسلم، متقی اور محسن بن گئے اور اس کام میں لگ گئے جو اللہ تعالیٰ کے وفاداروں کو کرنا چاہیے تھا، تب آپ نے ان کو بتانا شروع کیا کہ وضع قطع، لباس، کھانے پینے، رہنے سہنے، اٹھنے بیٹھنے اور دوسرے ظاہری برتاؤ میں وہ مہذب آداب و اطوار کون سے ہیں جو متقیوں کو زیب دیتے ہیں۔ گویا پہلے مس خام

کو کندن بنایا پھر اس پر اشرفی کا ٹھپہ لگایا۔ پہلے سپاہی تیار کیا پھر اسے وردی پہنائی۔ یہی اس کام کی صحیح ترتیب ہے جو قرآن و حدیث کے غائر مطالعہ سے صاف نظر آتی ہے۔ اگر اتباع سنت نام ہے اس طرزِ عمل کا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی مرضی پوری کرنے کے لیے ہدایت الٰہی کے تحت اختیار کیا تھا، تو یقیناً یہ سنت کی پیروی نہیں بلکہ اس کی خلاف ورزی ہے کہ حقیقی مومن، مسلم، متقی اور محسن بننے بغیر اپنے آپ کو متقیوں کے ظاہری سانچے میں ڈھالا جائے اور محسنوں کے سے چند مشہور و مقبولِ عام افعال کی نقل اتاری جائے۔ یہ پیسے اور تانبے کے ٹکڑوں پر اشرفی کا ٹھپہ لگا کر بازار میں ان کو چلانا اور سپاہیت، وفاداری اور جاں نثاری پیدا کیے بغیر نرے وردی پوش نمائشی سپاہیوں کو میدان میں لا کھڑا کرنا، میرے نزدیک تو ایک کھلی ہوئی جعل سازی ہے، اور اسی جعل سازی کا نتیجہ ہے کہ نہ بازار میں آپ کی ان جعلی اشرفیوں کی کوئی قیمت اٹھتی ہے اور نہ میدان میں آپ کے ان نمائشی سپاہیوں کی بھیڑ سے کوئی معرکہ سر ہوتا ہے۔

پھر آپ کیا سمجھتے ہیں کہ خدا کے ہاں اصلی قدر کس چیز کی ہے۔ فرض کیجیے کہ ایک شخص سچا ایمان رکھتا ہے، فرض شناس ہے، اخلاقِ صالحہ سے متصف ہے، حدود اللہ کا پابند ہے اور خدا کی وفاداری و جاں نثاری کا حق ادا کر دیتا ہے، مگر ظاہری فیشن کے اعتبار سے ناقص اور ظاہری تہذیب کے معیار سے گرا ہوا ہے۔ اس کی حیثیت زیادہ سے زیادہ بس یہی تو ہوگی کہ ایک اچھا ملازم ہے، مگر ذرا بدتمیز ہے۔ ممکن ہے اس بدتمیزی کی وجہ سے اس کو مراتبِ عالیہ نصیب نہ ہو سکیں، مگر کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس قصور میں اس کی وفاداری کا اجر بھی مارا جائے گا اور اس کا مالک صرف اس لیے اسے جہنم میں جھونک دیگا کہ وہ خوش وضع اور خوش اطوار نہ تھا؟ فرض کیجیے کہ ایک دوسرا شخص ہے جو بہترین شرعی فیشن میں رہتا ہے اور آدابِ تہذیب کے التزام میں کمال درجہ محتاط ہے، مگر اس کی وفاداری میں نقص ہے، اس کی فرض شناسی میں کمی ہے، اس کی غیرتِ ایمانی میں خامی ہے۔ آپ کیا اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس نقص کے ساتھ اس ظاہری کمال کی حد سے حد کتنی قدر خدا کے ہاں ہوگی؟ یہ مسئلہ تو کوئی گہرا اور پیچیدہ قانونی مسئلہ نہیں ہے جسے سمجھنے کے لیے کتابیں کھنگالنے کی ضرورت ہو۔ محض عقلِ عام سے ہی ہر آدمی جان سکتا ہے کہ ان دونوں چیزوں میں سے اصلی قدر کی مستحق کونسی چیز ہے۔ دنیا کے کم عقل لوگ بھی اتنی تمیز ضرور رکھتے ہیں کہ حقیقت میں قابلِ قدر شے کیا ہے۔ یہ انگریزی حکومت آپ کے سامنے موجود ہے۔ یہ لوگ جیسے کچھ فیشن پرست ہیں، اور ظاہری آداب و اطوار پر جس طرح جان دیتے ہیں اس کا حال آپ کو معلوم ہے۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ ان کے ہاں اصلی قدر کس چیز کی ہے؟ جو فوجی افسران کی سلطنت کا جھنڈا بلند کرنے میں اپنے دل و دماغ اور جسم و جان کی ساری قوتیں صرف کر دے اور فیصلے کے وقت پر کوئی قربانی دینے میں دریغ نہ کرے وہ خواہ ان کے نقطۂ نظر سے کتنا ہی اجڈ اور گنوار ہو، کبھی کئی دن شیو نہ کرتا ہو، بے ڈھنگا لباس پہنتا ہو، کھانے پینے کی ذرا تمیز نہ رکھتا ہو، رقص کے فن سے نابلد ہو، مگر ان سارے عیوب کے باوجود وہ اس کو سر آنکھوں پر بٹھائیں گے اور اسے ترقی کے بلند ترین مرتبے دیں گے۔ بخلاف اس کے جو شخص فیشن، تہذیب، خوش تمیزی اور سوسائٹی کے مقبولِ عام اطوار کا معیاری مجسمہ ہو لیکن وفاداری و جاں نثاری میں ناقص ہو اور کام کے وقت پر فرض اور تقاضائے غیرتِ قومی کے مقابلہ میں اپنی جان، اپنی راحت اور اپنے مصالح کا زیادہ لحاظ کر جائے اسے وہ کوئی عزت کا مقام دینا تو درکنار شاید اس کا کورٹ مارشل کرنے میں بھی دریغ نہ کریں۔ یہ جب دنیا کے کم عقل انسانوں کی معرفت کا حال ہے تو اپنے خدا کے متعلق آپ کا کیا گمان ہے؟ کیا وہ سونے اور تانبے میں تمیز کرنے کے بجائے محض ٹھپوں پر اشرفی کا ٹھپہ دیکھ کر اشرفی کی قیمت اور پیسے کا ٹھپہ دیکھ کر پیسے کی قیمت لگا دے گا؟

میری اس گذارش کو یہ معنی نہ پہنائیے کہ میں ظاہری محاسن کی نفی کرنا چاہتا ہوں، یا ان احکام کی تعمیل کو غیر ضروری قرار دے رہا ہوں جو زندگی کے ظاہری پہلوؤں کی اصلاح و درستی کے متعلق دیے گئے ہیں۔ درحقیقت میں تو اس کا قائل ہوں کہ بندۂ مومن کو ہر اس حکم کی تعمیل کرنی چاہیے جو خدا اور رسول نے دیا ہو، اور یہ بھی مانتا ہوں کہ دین انسان کے باطن اور ظاہر دونوں کو درست کرنا چاہتا ہے۔ لیکن جو چیز میں آپ کے ذہن نشین کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ مقدم چیز باطن ہے نہ کہ ظاہر۔ پہلے باطن میں حقیقت کا جوہر پیدا کرنے کی فکر کیجیے، پھر ظاہر کو حقیقت کے مطابق ڈھالیے۔ آپ کو سب سے بڑھ کر اور سب سے پہلے ان اوصاف کی طرف توجہ کرنی چاہیے جو اللہ کے ہاں اصلی قدر کے مستحق ہیں اور جنہیں نشوونما دینا انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا اصلی مقصود تھا۔ ظاہر کی آراستگی اول تو ان اوصاف کے نتیجے میں نظرۃً خود ہی ہوتی چلی جائے گی اور اگر اس میں کچھ کسر رہ جائے تو تکمیل مراحل میں اس کا اہتمام بھی کیا جا سکتا ہے۔

دوستو اور رفیقو! میں نے بیماری کے اور کمزوری کے باوجود آج یہ طویل تقریر آپ کے سامنے صرف اس لیے کی ہے کہ میں امر حق کو پوری وضاحت کے ساتھ آپ تک پہنچا کر خدا کے حضور بری الذمہ ہونا چاہتا ہوں۔ زندگی کا کوئی اعتبار نہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ کب اس کی مہلت عمر ان پوری ہو۔ اس لیے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ حق پہنچانے کی جو ذمہ داری مجھ پر عائد ہوتی ہے اس سے سبکدوش ہو جاؤں۔ اگر کوئی امر وضاحت طلب ہو پوچھ لیجیے، اگر میں نے کوئی بات خلاف حق بیان کی ہو تو اس کی تردید کیجیے، اور اگر میں نے ٹھیک ٹھیک حق آپ تک پہنچا دیا ہے تو اس کی گواہی دیجیے۔ (آوازیں: ہم گواہ ہیں)۔ آپ بھی گواہ رہیں اور خدا بھی گواہ ہو۔ میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ مجھے اور آپ سب کو اپنے دین کا صحیح فہم بخشے اور اس فہم کے مطابق دین کے سارے تقاضے اور مطالبے پورے کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

اس کے بعد جلسہ برخواست ہوا اور اجتماع کی کارروائی بھی ختم ہو گئی۔

دیگر اداروں کی مطبوعات جو ہمارے یہاں ملتی ہیں

حقیقت شرک۔ مولانا سندھی اور ان کے افکار و خیالات پر ایک نظر۔ ذہنی زلزلے۔ تفسیر سورۂ قیامہ (از مولانا حمید الدین فراہی) سورۂ لہب۔ سورۂ مرسلات۔ سورۂ والتین۔ سورۂ والشمس۔ سورۂ عبس۔ اقسام القرآن۔ اسلام اور اشتراکیت (از مولانا مسعود عالم صاحب ندوی)۔ اسلامی نظام (از حکیم محمد اسحاق صاحب سندیلوی)۔ اسلام کا نظریۂ سیاسی اور فلاح عالم (از حکیم محمد اسحاق صاحب)۔ علماء اور اسلام (از مولوی مظہر الدین صاحب صدیقی)۔ مسلمان کیا کریں۔ مسلمان کی پہچان۔ اسلام کا استغاثہ

ہماری زیر طبع مطبوعات

مسئلۂ جبر و قدر۔ بن حق۔ دینیات۔ تفہیمات۔ خطبات۔ مذہب کا انقلابی تصور

ملنے کا پتہ:

مکتبہ جماعت اسلامی۔ دار الاسلام۔ پٹھان کوٹ

(پنجاب)